

For More Urdu Books Please visit:
www.pakistanipoint.com

پنجوں
کی

الف



بچوں کی الف لیله

بچوں کے لیے دل چسپ کہانیاں

سید ابوالتمیم



فیروز سنٹر

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

کہانیاں

- 1 ————— مجھیر اور پتیل کی بوتل 5
- 2 ————— ہرالی مچھلیاں 17
- 3 ————— بولنے والا پرندہ، گانے والا درخت 46
- 4 ————— معروف مہرچی 75
- 5 ————— معروف شہزادہ بن گیا 94
- 6 ————— سندباد جہازی 116
- 7 ————— ہیروں کا جزیرہ 129
- 8 ————— سمندر کا بھٹنا 143

مچھیرا اور پتیل کی بوتل

ایک تھا مچھیرا - وہ سمندر میں مچھلیاں پکڑتا تھا۔ مگر ایک دن میں صرف چار مرتبہ جال ڈالتا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ایک دن مچھیرے نے سمندر میں جال ڈالا۔ کچھ دیر بعد جب رستی کھینچنی چاہی تو جال بھاری معلوم ہوا۔ وہ دل میں خوش ہوا کہ شاید بہت ساری مچھلیاں پھنس گئی ہیں۔ اُس نے زور لگایا، خوب زور لگایا مگر جال نہ کھنچ سکا۔ مچھیرے نے جال کی رستی کنارے پر باندھی، کپڑے اُتارے، پانی میں غوطہ مارا۔ پھر زور لگا کر جال کے اندر پھنسے ہوئے شکار کو باہر نکالا۔ بہت تیرے کی۔ وہ تو

اُس کے مُنہ پر ڈاٹ تھی۔ ڈاٹ پر مہر لگی ہوئی تھی اور مہر پر حضرت سلیمان کا نام کھدا ہوا تھا۔ حضرت سلیمان اللہ کے پیغمبر تھے۔ آدمی تو آدمی چرندے، پرندے، درندے اور جن بھی اُن کے غلام تھے۔

مُچھیرا دل میں کئے لگا، چلو مچھلی نہ سہی، بوتل ہی سہی۔ بازار میں بیچوں گا تو دو چار آنے مل جائیں گے۔ آج کا گوارہ تو چل ہی جائے گا۔

اُس نے جال کندھے پر رکھا اور بوتل اٹھا کر بازار کی طرف چلا۔ مگر دو چار قدم چل کر ہی رُک گیا۔ بوتل بہت بھاری تھی۔ اُس نے سوچا، ہو نہ ہو بوتل میں سونا بھرا ہوا ہے۔ جب ہی تو اتنی بھاری ہے۔ لاؤ، کھول کر دیکھوں تو۔

مُچھیرے نے اپنا چاقو نکالا اور مہر کو کھڑچا۔ پھر اُس نے ڈاٹ نکالی۔ ڈاٹ نکلتے ہی اس میں سے دھواں نکلا۔ کالا کالا۔ گاڑھا گاڑھا۔ اور نکلے چلا گیا۔ اتنا کہ زمین سے آسمان تک دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ پھر وہ سمٹنے لگا اور اس میں سے ایک جن نکلا۔ اللہ! اللہ! آفت کا

ایک مرا ہوا گدھا تھا۔ گدھے کو دیکھ کر مُچھیرے کو بڑا رنج ہوا۔ اُس نے اللہ کا نام لے کر دوسری بار جال پانی میں ڈالا لیکن اس بار بھی اُسے مایوسی ہوئی۔ اس دفعہ جال میں سے ایک جگ نکلا۔ ٹوٹا پھوٹا۔ بالکل بے کار۔

مُچھیرے نے یہ جگ دُور پھینکا۔ پھر جال صاف کیا اور تیسری مرتبہ اُسے پانی میں ڈالا۔ مگر ہائے۔ اس دفعہ جال میں سے کوڑا کرکٹ نکلا۔

اب تو بے چارہ بہت گھبرایا۔ آسمان کی طرف مُٹھ اٹھایا اور بولا:

اے میرے مولا، تو جانتا ہے کہ میں ایک دن میں صرف چار مرتبہ جال پانی میں پھینکتا ہوں۔ آج تین بار پھینکا اور کیا نکلا؟ کچھ بھی نہیں۔ اے اللہ میری مدد کر! یہ کہہ کر اُس نے چوتھی بار جال پھینکا اور جب اُسے باہر نکالا تو اُس میں سے ایک بوتل نکلی۔ پتیل کی بوتل۔ لمبوتری سی۔

مُچھیرے نے بوتل کو غور سے دیکھا۔



مُعات کر دیجیے۔“
مُچیرے نے کہا ”حضرت سلیمانؑ کو دُنیا سے اُٹھے
ایک ہزار آٹھ سو سال ہو گئے ہیں۔ میں تو ایک
مُچیرا ہوں۔“

”ہوں، تو یہ بات ہے؟ جن آنکھیں نکال کر بولا۔
اب اُس کا ڈر دُور ہو گیا تھا۔“ تو نے مجھے سُنَد سے
نکالا ہے؟“

”ہاں۔ میں نے ہی تمہیں سُنَد سے نکالا ہے۔“
مُچیرے نے کہا۔

”تو پھر مرنے کو تیار ہو جا۔“ جن گول گول دیدے
گُھا کر بولا۔

مُچیرے نے گُھرا کر کہا ”اے بابا۔ میں نے تیرا
کیا رِکاڑا ہے جو میری جان لینا چاہتا ہے؟“

”میں بتاتا ہوں کہ کیوں میں تیری جان لینا چاہتا ہوں؟“
یہ کہہ کر جن نے اپنا گلا صاف کیا، خُوب کھانا،
کھنکھالا اور پھر بولا:

”میں اُن جنوں میں سے ہوں جنہوں نے حضرت سلیمانؑ

تھا وہ جن۔ اتنا بڑا جیسے گُنبد۔ ٹانگیں ایسی جیسے بلی۔ دانت
ایسے جیسے من من بھر کے پتھر۔ اور آنکھیں؟ اللہ میری
توبہ! جیسے گیس کی لال ٹین۔



مُچیرا ڈر کے مارے کانپنے لگا مگر مرے دار بات یہ
ہے کہ جن بھی مُچیرے کو دیکھ کر تھرانے لگا۔ وہ ہاتھ
جوڑ کر بولا:

”اے خُدا کے پیارے رُسل، مجھے اب نہ ماریے۔ اب
میں ہمیشہ آپ کا کُنا ماؤں گا۔ کبھی کسی مُکَم سے انکار نہ
کروں گا۔ جو مُکَم آپ دیں گے، فوراً پُورا کروں گا۔ مجھے



کی نافرمانی کی تھی۔ اُن کا حکم نہ مانا تھا حضرت سلیمانؑ نے میرے قصود پر مجھے اس بوتل میں دھواں بنا کر بند کر دیا۔ بوتل کے منہ پر ڈاٹ لگا دی اور ڈاٹ کے اوپر اپنی مہر ٹھونک دی۔ جس مہر پر حضرت سلیمانؑ کی مہر ہو، اُسے کوئی جن نہیں کھول سکتا۔ پھر حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ اس بوتل کو سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ میں نے دل میں کہا جو کوئی مجھے اس بوتل سے نکالے گا، میں اُسے مال دار بنا دوں گا۔ اتنا مال خزانہ دوں گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔ لیکن میں بوتل میں رہا اور سو سال گزر گئے۔

”پھر میں نے دل میں کہا کہ جو مجھے اس بوتل سے نکال کر آزاد کرے گا، میں اُسے ساری دنیا کے خزانے نکال کر دے دوں گا۔ مگر کسی نے مجھے بوتل کی قید سے آزاد نہ کیا اور اسی طرح چار سو سال گزر گئے۔ پھر میں نے دل میں کہا کہ جو مجھے اس قید سے چھڑائے گا میں اُس کی تین خواہشیں پوری کروں گا۔ جو وہ مانگے گا، دوں گا۔“

پھاڑ جیسا جن اتنی چھوٹی سی بوتل میں بند کیسے ہو گیا۔ یہ
بوتل تو اتنی چھوٹی ہے کہ تیری انگلی بھی اس کے اندر
نہیں سما سکتی۔

”اچھا تو سمجھتا ہے، میں جھوٹا ہوں؟ میں اس بوتل کے
اندر بند نہیں تھا۔ ایں؟“

”بے شک۔ میرا یہی خیال ہے۔“ مچھیرا بولا۔

جن نے کہا ”لے دیکھ۔ میں تجھے بوتل میں بند ہو کے
دکھاتا ہوں۔“

جن کا یہ کہنا تھا کہ دھواں سا اٹھا اور آسمان تک
دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ پھر وہ دھواں بوتل کے اندر جانے
لگا، یہاں تک کہ سارا بوتل کے اندر سما گیا۔ مچھیرے نے
پھرتی سے ڈاٹ اٹھائی اور بوتل کے منہ پر لگا دی۔ جن
بوتل کے اندر قید ہو گیا۔

مچھیرا بولا ”بولو میاں جن، میں تمہیں کس طرح ماروں؟ سمندر
کی تہ میں پھینک دوں؟ پہاڑ سے بیچے دے ماروں یا زمین
کھود کر دبا دوں؟“

اب تو جن نے گڑگڑانا شروع کیا: ”مجھے نکال۔ رحم کر۔“

”یہ بہت بڑا انعام تھا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ کئی سو سال
گزر گئے۔ پھر تو میں نے دل میں کہا کہ جو مجھے اس
قید سے نکالے گا، اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جان
سے مار ڈالوں گا۔۔۔ یہ ہے میری کہانی۔ تو،
اے مچھیرے بول۔ تجھے کس طرح ماروں؟“

یہ سن کر مچھیرا غم سے بندھا ہوا ہو گیا۔ اُس نے
جن کو بہت سمجھایا۔ اللہ کا واسطہ دیا۔ رحم کی بھیک
مانگی مگر وہ ظالم ذرا نرم نہ ہوا۔ گردن ہلاتا رہا۔
مچھیرا سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ میں انسان اور یہ جن۔
بہت طاقت والا۔ اس کا میرا کیا مقابلہ۔ یہ یوں نہیں
مانے گا۔ اُسے تدبیر سے قابو میں لانا چاہیے۔

کچھ دیر سوچ کر مچھیرا بولا:

”بہت اچھا۔ اے مجھے مار کر اپنا دل ٹھنڈا کر لے۔
مگر مرنے سے پہلے میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں۔
سچ جواب دینا۔“

جن بولا ”کہہ، کیا کہنا چاہتا ہے؟ مگر لمبی بات نہ کرنا۔“
مچھیرے نے کہا ”میری عقل حیران ہے کہ تجھ جیسا لمبا ترنگا

اس پر جن منہ پھاڑ کر ہنسا، اتنے زور سے کہ دل
دہل جائے۔ اُس نے کہا: ”اٹھا اپنا جال اور آ میرے
ساتھ۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ مچھیرا اپنا جال سنبھالے پیچھے
ہو لیا۔ چلتے چلتے ایک پہاڑ آیا۔ وہ دونوں اُس پر
چڑھ گئے۔ پھر پیچھے کی طرف اُترے۔ یہاں تک کہ ایسے
علاقے میں پہنچے جسے مچھیرے نے پہلے کبھی نہیں دیکھا
تھا۔ یہاں ایک جھیل تھی۔ پانی سے لبا لب بھری ہوئی۔
اُس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ کچھ سفید، کچھ
نیلی، کچھ زیلی اور کچھ لال۔



جن نے کہا ”پانی میں جال ڈال۔ مگر یاد رکھ۔ ایک ایک

میں نے تیرے ساتھ بدی کی ہے مگر تو میرے ساتھ
نیک کر۔“

مچھیرے نے جواب دیا ”ہرگز نہیں۔ میں اس بوتل کو سمندر
میں پھینک دوں گا۔ بچوں پیچ کہ تو کبھی باہر نکل ہی نہ سکے۔“
جن نے پھر التبا کی۔ اُس نے بڑی نرم، نازک آواز میں
کہا: ”اللہ کے واسطے جو بڑا رحیم ہے، کریم ہے، میری بات
سن لیجیے۔ اگر آپ مجھ پر رحم کریں گے تو اللہ تعالیٰ قیامت
کے دن آپ سے بہت خوش ہو گا اور اس دُنیا میں
آپ کو اتنا زبردست انعام دوں گا کہ آپ، آپ کی اولاد،
بلکہ پوتے اور نواسے تک عیش کریں گے۔“

مچھیرے نے کچھ دیر سوچا۔ پھر جن سے قسمیں کھلائیں اور
وعدہ لیا کہ وہ کوئی بُری حرکت نہ کرے گا۔ جن نے قسمیں
کھائیں اور وعدہ کیا کہ وہ دغا نہ کرے گا۔ مچھیرے نے
ڈرتے ڈرتے بوتل کی ڈاٹ کھولی۔ ایک دم دھواں لپکا اور
جن بوتل سے نکل آیا۔ پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ بوتل اٹھا
کر دُور سمندر میں پھینک دی۔ پھر خوب ہنسا۔

مچھیرا بولا ”دیکھو، تم نے قسم کھائی ہے۔ اپنا وعدہ پُورا کرنا۔“

رنگ کی ایک ایک مچھلی اپنی ڈگری میں رکھنا۔ باقی واپس پانی
میں پھینک دینا۔ پھر چاروں مچھلیاں بادشاہ کے محل میں
لے جانا۔ بادشاہ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہو گا اور تجھے
انعام دے گا۔“

اتنا کہہ کر جن نے زمین پر زور سے پاؤں مارا۔ زمین
بھٹی اور جن اُس کے اندر غائب ہو گیا۔ مچھیرے نے چار
رنگ کی چار مچھلیاں پکڑیں اور بادشاہ کے محل کا راستہ لیا۔
بادشاہ نے اتنی پیاری، اتنی خوب صورت مچھلیاں خواب
میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور پھیرے
کو بہت سا انعام دیا۔

نرالی مچھلیاں

جس دن مچھیرا چار رنگوں کی چار مچھلیاں لے کر بادشاہ
کے محل میں پہنچا تھا اُس سے ایک دن پہلے بادشاہ کو
ایک عجیب قسم کا تحفہ ملا تھا اور اس تحفے سے بھی بادشاہ
بہت خوش ہوا تھا۔ یہ تحفہ تھا ایک کالی کلوٹی حبشی لڑکی جو
کھانے ایسے مزے دار پکاتی تھی کہ بس واہ۔ یہ لڑکی ایک راجا
نے بادشاہ کو تحفے میں دی تھی۔

اب بادشاہ کو جو یہ رنگ دار مچھلیاں ملیں تو اُس نے
سوچا کہ حبشی لڑکی کا امتحان لے اور یہ مچھلیاں اُس سے
پکوائے۔ وہ اس وقت اپنے تخت پر بیٹھا، لوگوں کی فریاد

خوب صورت لڑکی نے تلنے والا پچھو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا :
”اے مچھلیو، کیا تم اپنا وعدہ پورا کرو گی؟“
یہ سوال اُس لڑکی نے دو بار کیا۔ تیسری دفعہ جب یہی سوال پوچھا گیا تو مچھلیوں نے اپنا سر اُونچا کیا اور جواب دیا :
”ہاں، ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“



یہ جواب سنتے ہی اُس لڑکی نے کڑھائی اُلٹ دی اور مچھلیاں آگ میں جل جھن کر سیاہ ہو گئیں۔ اس کے بعد وہ لڑکی ایک قدم پیچھے ہٹی اور پھٹی ہوئی دیوار میں غائب ہو کر گئی۔ دیوار پہلے کی طرح جڑ گئی۔

سُن رہا تھا۔ فوراً وزیر کو حکم دیا کہ یہ مچھلیاں حبشی لڑکی کو دی جائیں اور اُسے کہا جائے کہ پکا اور اپنا ہنر دکھا۔ وزیر مچھلیاں لے کر محل میں گیا اور حبشی لڑکی سے کہا ”اے لڑکی، سنا ہے تو کھاتے بہت مزیدار پکاتی ہے۔ بادشاہ سلامت نے یہ خوب صورت مچھلیاں بھیجی ہیں اور حکم دیا ہے کہ یہ دوپہر کو دسترخوان پر ضرور رکھی جائیں۔ سنا تو نے؟ بادشاہ سلامت تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔“
حبشی لڑکی یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ اُس کا امتحان لیا جائے۔ اُس نے مچھلیوں کو صاف کیا اور ان پر مسالا لگایا۔ پھر ایک کڑھائی میں تیل ڈالا، آگ بجائی اور اُنھیں تلنے لگی۔
لڑکی بڑی ہوشیاری سے مچھلیاں تل رہی تھی۔ ایک ایک کو باری باری پلٹتی تاکہ چاروں ایک ہی طرح جھنیں۔ یہ کام ختم ہونے ہی والا تھا کہ اچانک باورچی خانے کی دیوار پھٹی اور اُس میں سے ایک گوری چوٹی خوب صورت لڑکی، عمدہ کپڑے پہنے، نکلی۔ حبشی لڑکی یہ دیکھ کر ڈر گئی سم گئی۔

سے کہا "انہیں پکا۔" لڑکی نے پھر پہلے کی طرح سب کام کیا۔ اس دفعہ وزیر بادپچی خانے ہی میں رہا اور سب کچھ دیکھتا رہا۔

لو صاحب، پھر دُری تماشا ہوا۔ حبشی لڑکی مچھلیوں کو تلنے بیٹھی تو ایک ایک بادپچی خانے کی دیوار بھٹی اور اُس میں سے دُری خوب صورت لڑکی، اچھے اچھے کپڑے پہنے، نکلی۔ اُس نے مچھلیوں سے وہی سوال کیے اور مچھلیوں نے سر اٹھا کر دُری جواب دیا۔ اس پر خوب صورت لڑکی نے کڑھائی اُلٹ دی اور مچھلیاں چوڑھے میں گر کر جل بھُن گئیں۔

وزیر گھبرایا ہوا بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ جو آنکھوں سے دیکھا تھا وہ بیان کیا۔

بادشاہ نے یہ قصہ سُن کر کہا:

"عجیب بات ہے۔ میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

مچھیرے سے کہو، کل صبح پھر مچھلیاں لائے۔"

مچھیرے کے مزے تھے۔ وہ صبح ہی چار مچھلیاں الگ الگ رنگوں کی، لے کر بادشاہ کے محل میں پہنچا۔

حبشی لڑکی نے جو یہ سارا تماشا دیکھا تو وہ بے چاری دُک کے مارے بے ہوش ہو گئی۔

جب عَشن کو ہوش آیا تو مچھلیاں جل بھُن کر کوملا بن گئی نغیں۔ غریب لڑکی نے سر پکڑ کر کہا "ہائے، اب کیا ہو گا۔ پہلے ہی امتحان میں فیل ہو گئی۔ بادشاہ کیا کہے گا؟" وہ جب یہ کہہ رہی تھی تو وزیر بادپچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اُس نے سُن لیا۔ وزیر نے کہا "لڑکی، بادشاہ سلامت مچھلیوں کا انتظار کر رہے ہیں اور تو ہے کہ رو رہی ہے۔"

غریب لڑکی نے وزیر کو سارا قصہ سُنا دیا۔ وزیر نیک دل تھا۔ یقین کر لیا۔ کہا "بے شک یہ مچھلیاں بڑی قسم کی ہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ بادشاہ کے پاس گیا اور اُس کو سارا قصہ سُنا دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اُس مچھیرے سے کہو کہ کل صبح ایسی ہی رنگ دار مچھلیاں لائے۔ مچھیرے نے یہ حکم سُنا تو خوش ہوا اور دوسرے دن چار مچھلیاں لایا۔ ایک سفید، ایک زرد، ایک نیلی اور ایک لال۔ مچھیرے کو بادشاہ نے اتنا انعام دیا کہ وہ خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

اب وزیر پھر یہ مچھلیاں لے کر محل میں گیا اور حبشی لڑکی

مچھلیاں کونکوں میں گر کر کونلا ہو گئیں۔ حبشی غائب ہو گیا۔
بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ اُس نے حکم دیا کہ مچھیرے کو
بلا کر لاؤ۔ جب چھیرا پہنچا تو بادشاہ نے پوچھا ”تم یہ پھلیاں
کہاں سے پکڑ کر لاتے ہو؟“

مچھیرے نے بتایا ”حضور، ادھر چار کالے پتھروں کے
پھاڑ ہیں۔ اُن کے بیچ میں ایک جھیل ہے۔ وہاں سے
پکڑ کر لاتا ہوں۔ میں نے پالی تھوڑی ہیں۔“
”وہ جھیل یہاں سے کتنی دُور ہے؟“ بادشاہ نے پوچھا۔
”حضور وہ جھیل قریب ہی ہے۔ ایک گھنٹے میں پہنچ
جانا ہوں۔“

اس جواب نے بادشاہ کو اور بھی چکر میں ڈال دیا۔
اس لیے کہ وہ اپنے ملک کے چپے چپے سے واقف
تھا۔ جو جگہ مچھیرے نے بنائی تھی وہاں پھاڑ تھے ہی نہیں۔
وزیر اور دربار کے دوسرے لوگ بھی حیران ہوئے کہ
ایک نہ دو اکٹھے چار پھاڑ یہاں کہاں سے آگئے اور
پھر ان کے بیچ میں جھیل۔ تعجب، حیرت! بادشاہ نے حکم دیا
”فوج نیا کر۔ ہم وہ جھیل آج ہی

اس دفعہ بھی بھاری انعام پایا اور خوش خوش گھر لوٹا۔
بادشاہ کو ایک نئی بات سوجھی۔ اُس نے وزیر سے
کہا ”یہ مچھلیاں یہیں رہیں گی۔ میری آنکھوں کے سامنے حبشی
لڑکی کو یہیں بلاؤ۔ چوٹھا، کونلے، کڑھائی، سب سامان یہیں
آئے۔ میرے سامنے مچھلیاں تلی جائیں گی۔“

وزیر نے عرض کیا ”حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔“
حبشی لڑکی چوٹھا، کڑھائی اور مسالے لے کر بادشاہ
کے دربار میں آئی۔ جب مچھلیاں تلنے لگی تو معلوم ہے
کیا ہوا؟ بڑا تماشا ہوا۔ کمرے کی دیوار کے دو ٹکڑے
ہو گئے اور اُس میں سے خوب صورت لڑکی کے بجائے
ایک خوف ناک شکل کا کالا بھجنگ حبشی نکلا۔ یہ آدمی کیا
تھا پورا بھٹتا تھا۔

اُس نے بھی مچھلیوں سے وہی سوال کیا ”اے مچھلیو،
کیا تم اپنا وعدہ پورا کرو گی؟“

جب تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو مچھلیوں نے سر اٹھایا
اور جواب دیا ”ہاں، ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“
یہ جواب سن کر اُس خوف ناک حبشی نے کڑھائی اٹا دی۔



دیکھیں گے۔“

پھیرا آگے آگے اور بادشاہ اور اُس کے سپاہی پیچھے پیچھے،
بھیل کی طرف چلے۔ پھیرا راستہ بتاتا جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل
میں جن کو کوس رہا تھا کہ کس مصیبت میں پھنسا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ کالے پہاڑوں کے پاس پہنچ گئے۔ پہاڑوں
کے بیچ میں بھیل تھی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ بھیل کے پانی میں
رنگ برنگ مچھلیاں مزے سے تیر رہی ہیں، کھیل رہی ہیں۔
یہ پہاڑ اور بھیل بادشاہ نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے
سپاہیوں سے پوچھا تو انہوں نے بھی کانوں کو ماتھ لگائے۔
سب حیران تھے کہ شہر کے اتنے قریب اتنے اونچے
اونچے پہاڑ اور ایسی پیاری بھیل موجود ہے اور شہر والوں
کو خبر ہی نہیں۔

بادشاہ نے کہا ”میں اس بھیل کا اور اس کی مچھلیوں کا
حال جان کر ہی رہوں گا۔“

اُس نے فوج کو حکم دیا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔
رات کا کھانا کھا کر بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور اپنے
خیچے میں لے جا کر کہا:

میں آج رات کو مچکے سے باہر نکلوں گا ، ان پہاڑوں کو دیکھوں گا اور ان کے پار جا کر یہ بھید معلوم کروں گا۔ ہو سکتا ہے ، میں ایک دو دن تک واپس نہ آؤں تم میرے نیچے کے باہر رہنا۔ جو مجھ سے ملنے آئے ، کہہ دینا بادشاہ سلامت بیمار ہیں۔ کوئی اندر نہیں جا سکتا۔

وزیر نے سوچا ، بادشاہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اُس نے بہت سمجھایا بچھایا مگر بادشاہ نہ مانا ، اپنی جند پر اڑا رہا۔ یہ دیکھ کر وزیر چپ ہو رہا۔

بادشاہ نے اپنا شان دار لباس اتار دیا ، بھیس بدلا ، تلوار کمر سے باندھی اور اندھیرے میں نکل گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا ، وہ تم اگلی کہانی میں پڑھو گے۔

کالے پہاڑوں کی جاؤ گرنی

اندھیری رات تھی۔ بادشاہ اکیلا اپنے نیچے سے نکلا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں چند منٹوں میں پہاڑوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پہاڑ پاس ہی نظر آ رہے تھے۔ مگر اب جو اُس نے چلنا شروع کیا تو رات بھر چلتا ہی رہا۔ صبح ہو گئی ، پھر بھی وہ پہاڑ تک نہ پہنچ سکا۔ سورج نکلا ، گرمی بڑھی۔ زمین تپنے لگی۔ بادشاہ کو گرمی میں پیدل چلنے کی عادت نہ تھی۔ اُس کے پاؤں چلنے لگے ، آنکھیں چنڈھیانے لگیں۔

چلتے چلتے بادشاہ نے دیکھا کہ پہاڑوں کے بجائے کچھ اور ہی چیز ہے۔ قریب پہنچا تو ایک محل نظر آیا۔ اور قریب گیا

آخر تھک مار کر دُہ ایک بڑے سے کمرے میں گیا۔ کمرے کی دیواریں کالے پتھروں کی تھیں اور چھت بھی کالی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک فوارہ تھا۔ فوارے کے چاروں طرف پیالے پیارے پرندے اُڑ رہے تھے۔ بادشاہ نے سوچا چلو، کوئی تو جان دار چیز اس اُجاڑ محل میں نظر آئی۔



بادشاہ فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چلو بھر کر پانی پیا۔ فوارے کے حوض میں اندر ہی اندر سے تازہ پانی آ

رہا تھا، بہت صاف شفاف۔ جیسے چاندی۔ پرندے چمک رہے تھے۔ یکایک کسی کے گانے کی آواز آئی۔ آواز بہت ہلکی تھی۔ بادشاہ نے کان لگا کر سنا اور پھر اُس طرف کو بڑھا۔ دھڑ سے آواز آ رہی تھی۔

بائیں ہاتھ کو ایک دروازہ تھا۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ بادشاہ نے پردہ ہٹایا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت ہی خوب صورت نوجوان، قیمتی لباس پہنے، ایک چوکی پر بیٹھا ہوا ہے اور بڑی درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھ رہا ہے۔

تو یہ شان دار محل بہت پیارا معلوم ہوا۔ یہ کالے پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ جب بادشاہ محل کے چھانک پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ آدھا کھلا ہے۔ اُس نے چھانک کے کواڑوں کو کھٹ کھٹایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی شخص نہیں آیا۔ ہاں کھٹ کھٹانے کی آوازیں گونجتی رہیں۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ اس محل میں کوئی نہیں رہتا۔ خالی پڑا ہے۔



وہ بہت کر کے چھانک کے اندر داخل ہوا۔ ایک صحن ملا۔ وہ ختم ہوا تو دوسرا صحن شروع ہوا۔ بادشاہ آوازیں دیتا ہوا بڑھے چلا گیا۔ وہ کہتا جا رہا تھا۔ ”میں مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ مجھے راستہ دکھاؤ۔“

ان آوازوں پر بھی کوئی نہ آیا۔ اُس کی آواز گونجتی رہی۔

میں قیمت کے ہاتھوں پریشان ہوں
کہاں منہ چھپاؤں ، میں حیران ہوں
نوجوان نے بادشاہ کو دیکھا تو چپ ہو گیا ۔ کچھ دیر دونوں
ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ۔ پھر وہ نوجوان بولا :
" آؤ مسافر ، آؤ ۔ میں کھڑے ہو کر آپ سے ملنا مگر مجبور
ہوں ۔ معاف کرنا ۔ "

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور رٹنے
لگا ۔ بادشاہ کو تعجب ہوا کہ یہ حسین نوجوان کیوں یہاں اکیلا
بیٹھا ہوا ہے اور کیوں اتنا اُداس ہے ؟ وہ اُس کے قریب
آیا اور بڑی محبت سے پوچھا " تم کیوں روتے ہو ؟ "



"جس کا یہ حال ہو جو میرا ہے ، وہ روئے گا نہیں تو



جے۔" ابو سعید سر پیٹ کر بولا
"کون ظالم؟ بادشاہ نے پوچھا؟
"ٹھہریئے، میں آپ کو ساری کہانی سناتا ہوں۔ ابو سعید
نے کہا "مجھے حکومت کرتے پانچ سال ہو گئے تھے لیکن میں
نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی کیونکہ میری نظروں میں کوئی
لڑکی جیتی ہی نہیں تھی جس سے میں بیاہ کرتا۔ ایک دن ایک
لڑکی میرے دربار میں آئی۔ بہت خوب صورت، جیسے
چودھویں کا چاند۔ اُس نے کہا کہ میں ایک ملک کی شہزادی
ہوں۔ میرے ملک پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں
کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ آئی ہوں۔ خدا کے
لئے مجھے پناہ دیجیے۔ میں نے اسے محل میں رکھ لیا اور
کچھ دن بعد اُس سے شادی کر لی۔ میرے عزیزوں اور
وزیروں نے بہت منع کیا۔ اُنھوں نے کہا، ایسی لڑکی سے
شادی کرنا ٹھیک نہیں ہے آپ جانتے نہ ہوں۔ مگر میں
نہ مانا اور اُسے اپنی بلکہ بنا لیا۔
ہماری شادی کو ایک سال گزر گیا۔ ایک دن میں محل
کے ایک درخت تلے بیٹھا تھا کہ نیند آنے لگی۔ میں

کیا کرے گا۔"
یہ کہہ کر نوجوان نے رینا کرتا اٹھایا۔ بادشاہ یہ دیکھ کر
حیران رہ گیا کہ نوجوان کا سینہ اور پیٹ پتھر کا ہے۔ اُسے
بہت افسوس ہوا اور اُس نے نوجوان سے کہا "اگر تم
اپنی مصیبت کی وجہ بتاؤ تو میں اُسے دُور کرنے کی ضرور
کوشش کروں گا۔"
یہ سن کر نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا:
"اے شخص میری کہانی سن۔ میرا نام ابو سعید ہے۔ میں کبھی
ایک بھرے پُورے ملک کا بادشاہ تھا۔ دُنیا بھر کا آرام
مجھے میسر تھا لیکن مائے اب کچھ بھی نہیں رہا۔ سارا ملک
اُڑ گیا۔ صرف میں اکیلا رہ گیا۔ لیکن میں بھی نہ زندوں میں
ہوں، نہ مردوں میں۔ پتا نہیں کن گناہوں کی سزا مجھے مل رہی ہے۔
اتنا کہہ کر نوجوان رُکا اور بولا "ہاں، میں یہ پوچھنا تو بھول
ہی گیا کہ آپ کون ہیں اور آپ کا نام کیا ہے؟"
بادشاہ نے کہا "میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ میرا نام
سلطان ہے۔"
"مائے مائے۔ تو اُس ظالم نے مجھے یہاں لا کر بندی بنایا

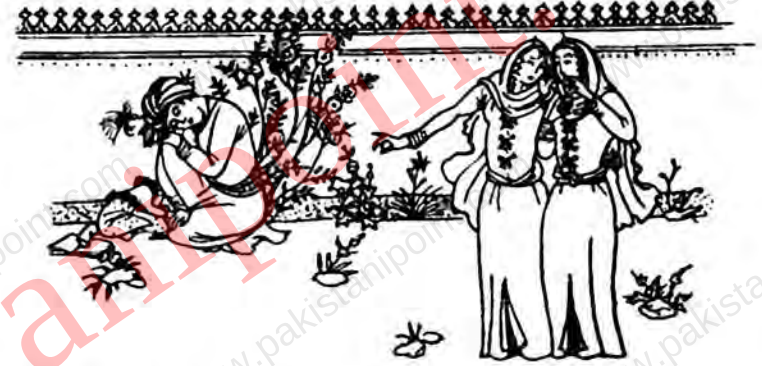
اور اس شربت میں ایسی دوا گھول دیتی ہے کہ بادشاہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چپ چاپ باہر نکلتی ہے اور جنگل میں چلی جاتی ہے۔ وہاں ایک جھونپڑی ہے جس میں ایک جادوگر رہتا ہے۔ وہ ملکہ کا باپ ہے۔

”ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ پہلی نے کہا۔
”اے مسافر مہربان، میں نے یہ باتیں سنیں تو پسینہ آگیا۔ رات کو جب ملکہ شربت کا گلاس لے کر آئی تو اسے نہ پیا۔ آنکھ بچا کر پھینک دیا۔ پھر روز کی طرح بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سمجھی میں سو گیا۔ اُس نے کپڑے بدلے اور کمرے سے نکلی۔ میں نے بھی تلوار کمر سے باندھی اور دیکا دیکا اس کے پیچھے پیچھے چلا۔“

”اے بادشاہ! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔ وہ تو بہت بڑی جادوگرنی نکلی۔ محل کے تمام قُصُل اُس کی اُنکلی لگانے سے کھٹتے چلے گئے۔ وہ کچھ منتر پڑھتی اور دروازے چوہٹ کھُل جاتے۔“

”مجھے اب یقین آ گیا کہ لڑکیاں جو باتیں کر رہی تھیں وہ سب سچ تھیں۔ جنگل آ گیا۔ ملکہ جنگل میں گھس گئی۔ وہاں

نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں میری دو لڑکائیاں ادھر سے گزریں۔ وہ سمجھیں، میں سو رہا ہوں۔ اُن میں سے ایک



لڑکی بولی ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہماری ملکہ بادشاہ کو دھوکا دے رہی ہے۔“

دوسری نے کہا ”اے بہن، وہ بڑی بد ذات اور مکار عورت ہے۔ دیکھ لینا ایک دن بادشاہ کو مار کر سارے ملک پر قبضہ کر لے گی۔“

”سچ کہتی ہو۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ بادشاہ کو جان سے مار کر ہی رہے گی۔“

یہ سن کر دوسری نے کہا ”اے بہن، یہ مکار ملکہ بھولے بادشاہ کو رات کے وقت شربت کا گلاس پلاتی ہے

منتر پڑھنے لگی۔ وہ منتر ایسے تھے کہ میرا آدھا بدن
پتھر کا بن گیا اور میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ پھر وہ مجھے
اٹھا کر یہاں لے آئی۔ یہاں اس نے جادو کے زور سے
پیاز بنائے۔ پیازوں کے بیج میں جھیل بنائی۔ پھر ایک محل
بنایا اور اس میں مجھے بٹھا دیا۔ وہ ظالم میرے سب عزیزوں
رشتے داروں اور وزیروں کو بھی لے آئی تھی۔ انہیں اُس
نے پھیلیا بنا دیا اور اس جھیل میں چھوڑ دیا۔

”اب وہ کم بخت روز یہاں آتی ہے اور مجھے ستاتی ہے۔
اُسی نے مجھے بتایا کہ جادوگر مرا نہیں بلکہ زخمی ہو گیا ہے۔
اُس کے زخمی ہونے کا بدلہ وہ مجھ سے لیتی ہے۔ روز میرے
کوڑے مارتی ہے۔ جب میں تکلیف سے چپخٹا ہوں تو وہ خوش
ہوتی ہے۔ اے بادشاہ، یہ ہے میری کہانی۔“
بادشاہ نے ساری کہانی سنی، بہت گڑھا، افسوس کرتا رہا۔
پھر بولا:

”مجھے اتنا بتا دو کہ وہ ذلیل جادوگر کہاں ہے؟ میں تم
کو اس مصیبت سے چھڑا کر ہی دم لوں گا۔“
ابو سعید نے بتایا کہ جادوگر محل کے باغ کے اندر، ایک

ایک جھونپڑا تھا جہاں اُس کا باپ جادوگر رہتا تھا۔ میں اس
جھونپڑے کی چھت پر چڑھ گیا اور دونوں کی باتیں سُننے لگا۔
وہ دونوں مجھے مارنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ یہ سُن کر
مجھے اتنا غصہ آیا کہ نہ پوچھیے۔ چھت سے نیچے اُترا،
جھونپڑے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ وہاں بالکل
اندھیرا تھا۔ میں نے تلوار کھینچ لی اور جادوگر کی گردن پر
بھرپور وار کیا۔ میں نے سمجھا کہ اس کی گردن اڑ گئی ہوگی۔
مگر اندھیرے میں ٹھیک ٹھیک نہ دیکھ سکا۔ وہ لوگ بھی مجھے
نہ دیکھ سکے ہوں گے۔

”وہاں سے میں چپ چاپ واپس ہوا اور غم سے
بڈھال اپنے محل میں آ گیا۔“

”اے سلطان، مجھے اپنی ملکہ سے بہت محبت تھی۔ میں
نے اُسے مُعاف کر دیا، یہ سمجھ کر کہ جادوگر مر چکا ہے۔
اب یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ملکہ نے بھی ایک حرف مجھ
سے نہ کہا۔ لیکن ایک دن غصے میں آکر، میں نے
اُس رات کا قصہ اُسے سنا دیا اور جو کچھ باتیں اُس کی اور
جادوگر کی سنی تھیں، کہہ ڈالیں۔ یہ سُن کر وہ اُٹھ بیٹھی اور

”میرے پیارے آبا، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“
بادشاہ نے آواز بدل کر کہا۔
”اے بے وقوف لڑکی، بھلا میں کیسے اچھا ہو
سکتا ہوں، جب کہ تو مجھے ایسی تکلیف دیتی
ہے۔ آہ، اہ۔“

”ارے میری قسمت، آپ بولے تو محکم دیجے
آپ کیا چاہتے ہیں؟ بولیے بولیے۔“
بادشاہ نے پھر اُسی طرح جواب دیا۔ ”یہ جو تو
اپنے شوہر کو روز مارتی ہے اور وہ چیتا چلاتا
ہے، ان آوازوں سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اگر
یہ شور نہ سُنتا تو کبھی کا ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔
آہ، ہاہ۔“

مکہ نے کہا ”آپ نے پہلے کیوں نہ محکم دیا۔
میں ابھی جاتی ہوں اور اُسے آزاد کر دیتی ہوں۔“
بادشاہ نے پھر ہائے ہائے کرتے ہوئے کہا
جاؤ مگر ذرا جلدی واپس آنا۔“
بس جناب، وہ مکار جادوگرنی دوڑی دوڑی اپنے

مکان میں رہتا ہے اور ابھی تک اچھا نہیں ہوا ہے۔
بادشاہ نے وہ مکان تلاش کر لیا جہاں جادوگر رہتا تھا۔
وہ ایک درخت کے نیچے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد
مکہ مکان سے نکلی اور اپنے شوہر کی پٹائی کرنے کے لیے کوڑا ہاتھ
میں لے کر چلی۔ جب وہ دُور چلی گئی تو بادشاہ درخت
کی اوٹ سے نکلا اور سیدھا مکان میں گیا۔ یہاں ایک
چھپر کھٹ پر جادوگر لیٹا
ہوا تھا۔ بادشاہ نے ایک ہی



وار میں جادوگر کا سر اڑا دیا اور اُسے اٹھا کر ایک کنویں
میں پھینک دیا۔ پھر وہ جلدی سے واپس آیا، جادوگر کے
کپڑے الماری میں سے نکال کر پہنے اور اس کی جگہ خود
چھپر کھٹ پر سو گیا۔
تھوڑی دیر بعد مکہ آئی اور بولی:

بنا دیا ہے ، پھر انسان نہ بنا دو ۔ ہر رات یہ
پھیلیاں پانی سے سر نکال کر مجھے کوستی ہیں ۔
جاؤ ، منتر پڑھو اور اُن مچھلیوں کو انسان بناؤ ۔
ملکہ یہی سمجھتی رہی کہ اُس کا باپ جادوگر اُسے
حکم دے رہا ہے ۔ وہ جھیل کی طرف گئی اور منتر
پڑھے ۔ لو ، کتنے تعجب کی بات ہوئی ۔ اُس سُنان
جگہ میں ایک ایسا انسان پھرنے لگے اور خوب چل پھل
ہو گئی ۔

ملکہ جادوگر کے پاس آئی اور بولی ”میرے پیارے
ابا ، آپ کا حکم پورا ہو گیا ۔ اب اُٹھیے ، دوا پی
لیجیے ۔“

یہ کہہ کر میٹھنی ملکہ نے بادشاہ کو سہارا دے کر
اُٹھانا چاہا ، بادشاہ کی تلوار ہوا میں لہرائی ۔ بجلی سی
چمکی اور ملکہ کا سر کٹ کر دُور جا پڑا ۔ اُس کے
ساتھ ہی جھیل اور پہاڑ بھی غائب ہو گئے ۔
بادشاہ نے خوش ہو کر اتنی زور کا نعرہ لگایا
جیسے کوئی قلعہ فتح کیا ہو ۔

شوہر کے پاس گئی ۔ فوارے سے پانی لیا اور اُس پر
کچھ پڑھ کر شوہر کے پیٹ پر چھڑکا ۔
بادشاہ ابو سعید بالکل ٹھیک ہو گیا ۔ ملکہ نے غصے
سے کہا ”کم بخت جا ، بھاگ جا ۔ نکل جا یہاں سے۔“
ابو سعید جلدی سے اُٹھ کر باہر بھاگ گیا اور
ملکہ جادوگر کی طرف روانہ ہوئی ۔ وہاں پہنچ کر بولی ۔
”پیارے ابا ، میں نے اُس کو یہاں سے بھگا دیا
ہے ۔ اب آپ اُس کی آواز نہ سُن سکیں گے اور

جلدی تن درُست
ہو جائیں گے ۔“

بادشاہ نے
جواب دیا
”میں اُس
وقت تک
اچھا نہیں
ہو سکتا ،

جب تک تم اُن لوگوں کو جن کو تم نے مچھلیاں



لے لو " بادشاہ، ابوسعید اور اُس کے رشتے داروں اور وزیروں کو لے کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں بادشاہ نے ابوسعید کو اُس لڑکی اور حبشی کا قصہ سنایا جو پھیلیوں سے آ کر پوچھتے تھے کہ کیا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ؟

ابوسعید یہ سُن کر بہت حیران ہوا اور بولا " مجھے پتا نہیں کہ وہ کون تھے ؟ ہو سکتا ہے کہ وہ جن ہوں اور اس طرح وہ آپ کو اس جادو نگری تک پہنچانا چاہتے ہوں۔ سنا ہے کہ جن دکھیانوں کی مدد کرتے ہیں، اپنے میں بادشاہ کا شہر آ گیا۔ سارے لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ رات کو گھر گھر دیے جلانے گئے۔ خوب چراغاں ہوا۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کچھ دن بعد بادشاہ کو بھیرا یاد آیا۔ کون سا بھلاؤسی جو چار رنگ کی پھیلیاں لاتا تھا۔ بادشاہ نے حکیم دیا اسے فوراً حاضر کرو۔ وہ حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا " لے مجھے تیری پھیلیوں نے

ابوسعید ایک درخت کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا۔ اُس نے بادشاہ کا نعرہ سنا تو دوڑا دوڑا آیا اور بادشاہ کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

" آپ نے کہاں کر دیا۔ میں آپ کا احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ مگر وہ جادوگر کہاں ہے ؟ وہ شیطان جس نے مجھ پر یہ سب ظلم کروائے ؟ " بادشاہ مسکرایا اور بولا۔

" وہ کنوئیں میں پڑا ہے۔ اُس کو بھی میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اچھا، اب آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میرے شہر چلیے۔ کچھ دن وہاں آرام کرنا پھر اپنے وطن کو چلے جانا۔ "

ابوسعید یہ سُن کر مسکرایا اور بولا " میں آپ کا ہر حکم مانوں گا۔ آج سے آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیے۔ بادشاہ نے جواب دیا " مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ایک باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے۔ اور قسمت سے میرا کوئی بیٹا نہیں۔ صرف ایک بیٹی ہے۔ او، اب چلیں۔ اپنے رشتے داروں اور وزیروں کو بھی

”اے لوگو، یہ میرا منہ بولا بیٹا تھا، اب سچ پٹھ
کا بیٹا بن گیا۔ میرے بعد یہی اس ملک کا بادشاہ ہوگا۔“
ابوسعید نے کچھ دن بادشاہ کے شہر میں آرام کیا۔
پھر اپنے رشتے داروں، وزیروں اور دُھن کو لے کر
اپنے ملک کو چلا گیا۔ اور جب بادشاہ اللہ کو پیارا
ہوا تو وہ اُس ملک کا بھی بادشاہ بن گیا۔
جیسی خدا نے اُس کی پھیری، ویسی سب کی پھیرے۔

میرے بیٹے ابوسعید کی جان بچائی۔ بے شک تو
انعام کے قابل ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟“



پچھلا گھبرا کر بولا ”حضور، میری سمجھ میں تو آتا نہیں
کیا مانگوں۔ آپ ہی کچھ دے دیجیے۔“
یہ سن کر بادشاہ نے اُسے ایک گاؤں، دو گھوڑے،
تین اونٹ، چار گدھے، پانچ بھینسیں، بارہ بیل، چھ ہل،
اٹھ بکریاں، نو بھٹریں، دس مرغابیاں، گیارہ مرغیاں،
بارہ کبوتر، چودہ تھان کپڑے کے اور دس جوڑے جوتے
کے دیے اور کہا ”جاؤ، موج کرو۔“
اس کے بعد بادشاہ نے اپنی بیٹی کا نکاح ابوسعید سے
کر دیا اور بھرے دربار میں اعلان کیا،



کے اندر جھانکنے لگا۔ تین خوب صورت لڑکیاں چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ تینوں بہت خوش تھیں۔ سب سے بڑی بہن کہہ رہی تھی میری مٹا تو ہے کہ میری شادی بادشاہ کے باورچی کے ساتھ ہو جائے۔ مزے آجائیں گے۔ مزے مزے کے کھانے، کھانے کو ملیں گے۔

دوسری بولی "اے بہن، میری خواہش تو یہ ہے کہ بادشاہ کے درزی سے میری شادی ہو جائے۔ ایسے عمدہ عمدہ ہلک، زری اور مخمل کے کپڑے پہنے کہ میں گئے کہ لطف آ جائے گا۔"

بولنے والا پرندہ، گانے والا درخت

یہ ایران کے ایک بادشاہ کا قصہ ہے۔ وہ بہت نیک اور انصاف والا بادشاہ تھا۔ روز رات کو بھی بدل کر اپنی رعایا کا حال معلوم کرنے نکلا کرتا تھا۔ کبھی فقیر کا لباس پہن کر امیروں کے دروازوں پر جاتا کہ دیکھوں وہ بھیک دیتے ہیں کہ نہیں، اور کبھی مزدوروں کاریگروں سے دوستی گانتھتا اور ان کا حال پوچھتا۔

ایک دن وہ اپنے دو وزیروں کے ساتھ شام کو ٹہلنے نکلا۔ شہر کے باہر ایک جھونپڑی کے پاس سے گزرا تو باتوں کی آواز آئی۔ بادشاہ وہیں رُک گیا اور جھونپڑی

دربار والوں کو بڑی دو بہنوں کی شادی پر تو خوشی ہوئی
مگر چھوٹی بہن کے ملکہ بننے پر ان کو رنج ہوا۔ ان کے
خیال میں بادشاہ کو اتنی غریب لڑکی کو ملکہ بنانا نہیں چاہیے
تھا۔ لیکن اس غریب ملکہ نے سب کو خوش کر دیا۔ وہ
بہت اچھی اور نیک لڑکی تھی۔ محل کے سب لوگوں کے
ساتھ اچھا برتاؤ کرتی۔ لیکن ملکہ کی بڑی بہنیں اس سے
خوش نہ تھیں۔ وہ دل میں حسد کرنے لگیں اور چھوٹی بہن
کے خلاف ہو گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بادشاہ ناراض ہو کر
اسے چھوڑ دے۔

آخر بڑی بہنوں کو ایک موقع مل گیا۔ ملکہ کو اللہ میاں
نے ایک چاند سا بچہ دیا۔ دونوں بہنیں ملکہ کے پاس ہی
تھیں۔ انہوں نے بچے کو تو چھپا لیا اور سارے محل میں
یہ اڑا دی کہ ملکہ کے بچے کا بچہ ہوا ہے۔ انہوں
نے بچے کا ایک بچہ لاکر جھوٹے میں ڈال بھی دیا۔
بڑی بہن شہزادے کو ٹوکری میں چھپا کر دریا پر لے
گئی اور ٹوکری دریا میں ڈال دی۔ ٹوکری ڈوبکیاں لیتی، پانی
کے نیچے اوپر ہوتی، چلی چلی گئی۔ بڑی بہن بھی کہ ذرا

تیسری بہن، جو سب سے چھوٹی تھی، خاموش رہی۔
بڑی بہنوں نے کہا ”تم بھی تو اپنی کوئی خواہش بتاؤ۔“
تھاری تمنا کیا ہے؟“

چھوٹی بہن بولی ”اے بہن، میری کیا پوچھتی ہو۔ میں جو
چاہتی ہوں وہ ہونا مشکل ہے۔ میری تمنا تو یہ ہے کہ خود
بادشاہ سے میری شادی ہو جائے۔“
یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھی اور ایسے تن کر بھونپڑی
میں ٹھلنے لگی جیسے سچ سچ وہ بادشاہ کی ملکہ ہے۔
دونوں بہنیں اس کی اڑاہٹ پر ہلنے لگیں۔

بادشاہ کو یہ مذاق بڑا بھایا۔ وہ بھی مسکرایا اور اپنے
محل کی طرف چل پڑا۔ دوسرے دن صبح ہی اس نے
محل کی خادماؤں کو اتا پتا بتا کر بھیجا اور کہا تینوں بہنوں
کو بلا لائیں۔

جب تینوں بہنیں آ گئیں تو بادشاہ نے بڑی بہن کی
شادی اپنے باورچی سے اور منجھلی بہن کی شادی اپنے
درزی سے کر دی اور خود چھوٹی سے بیاہ رچایا۔
تینوں کے مزے آ گئے۔ دل کی مراد پوری ہو گئی۔

بادشاہ چُپ ہو گیا اور بلکہ اور بادشاہ ہنسی خوشی رہتے رہے۔ ملکہ کی بہنیں اس بات سے جلتی تھیں۔ خدا نے دوسرے سال پھر ملکہ کو ایک لڑکا دیا۔ دونوں بہنیں اس دفعہ بھی ملکہ کے پاس تھیں۔ انھوں نے لڑکے کو ٹوکری میں بند کر کے دریا میں بہا دیا اور مشہور کر دیا کہ ملکہ کے ہاں بطخ کا بچہ ہوا ہے۔

بادشاہ یہ خبر سُن کر پہلے تو حیران ہوا۔ اتنا حیران کہ مُنہ سے بات تک نہ نکلی۔ پھر اُسے غصہ آیا۔ ایسا غصہ کہ دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے کہا "ملکہ کو محل سے نکال دیا جائے۔" مگر اس دفعہ بھی وزیروں نے بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ وہ اپنی ملکہ سے بہت خوش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی شریف اور نیک ملکہ انھیں اور کوئی نہیں ملے گی۔ وزیروں، درباریوں کے کہنے سے بادشاہ خاموش ہو گیا۔

خدا کی شان دیکھو کہ وہی مالی، جس کو پہلا بچہ ملا تھا، اس دفعہ بھی دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ اُس نے ٹوکری تیرتی دیکھی تو کپڑے اتار، دریا میں کودا اور ٹوکری نکال

دور جا کر ڈوب جائے گی۔

بادشاہ کے محل کے پاس ایک ندی بہتی تھی محل کے باغ کے مالی نے دیکھا کہ ایک ٹوکری بہتی جا رہی ہے تو اُس نے جلدی سے کپڑے اتارے اور ندی میں سے ٹوکری نکال لیا۔ اب جو ٹوکری کھولی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ننھا مُنّا خوب صورت بچہ پڑا کل کاریاں مار رہا ہے۔ مالی کو اس پر بہت پیار آیا۔ اُس کے گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہ خوش خوش گھر آیا اور بیوی سے کہا "یہ دیکھ، خدا نے تجھے کیسا چاند سا بیٹا دیا ہے۔"

مالن بچے کو دیکھ کر بولی "میں صدقے جاؤں۔ اے، یہ تمھیں کہاں سے ملا؟" اس پر مالی نے سب حال سنایا۔ اب سُنو بادشاہ کا حال۔ جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کے ہاں بلی کا بچہ ہوا ہے تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اُن دونوں وزیروں نے، جو اُس دن بادشاہ کے ساتھ جھونپڑی تک گئے تھے، کہا:

"جناب عالی، اس میں ملکہ کا کوئی قصور نہیں۔ اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔"

لایا۔ اب جو ٹوکری میں دیکھا تو اُس میں دیسا ہی پیارا ، چاند سا بچہ بیٹا ہوا تھا جیسا ایک سال پہلے اُسے دریا میں سے ملا تھا۔ وہ خوشی خوشی ٹوکری لے کر گھر آیا اور بیوی کو حال سُنا یا۔ بیوی کہنے لگی " میں اس کو پالوں گی۔ اے دیکھنا ، کیسے منزے سے سو رہا ہے۔ میں اس کے صدقے۔"

اب تیسرے سال کی صُفر۔ اس سال ملک کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس دفعہ بھی دونوں بہنیں ملک کے پاس موجود تھیں اور اُس کی خدمت ، خوشامد میں لگی ہوئی تھیں۔ اب کی ملک کے ہاں ایک پیاری سی لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ کی بہنوں نے اسے جھٹ پٹ چھپا لیا اور بادشاہ سے کہہ دیا کہ سپہلیا ہوا ہے۔ بڑی بہن ٹوکری میں بھٹی شہزادی کو بند کر کے جلدیا میں بھا آئی۔

اس دفعہ بھی مالی کو ٹوکری بھتی نظر آئی۔ وہ تیرتا ہوا گیا اور ٹوکری نکال لیا۔ گھر آ کر بیوی سے بولا " ادی ٹیک بخت ، بھاگ کر آ۔ اب کی اللہ میاں نے ہمیں چاند سی بیٹی دی ہے۔"

مالی جلدی سے آئی اور بچی کو دیکھ کر بولی " میں صدقے جاؤں۔ اے اللہ تو کتنا مہربان ہے۔ بھر بیٹھے ہم کو دو چاند سے بیٹے اور ایک پیاری سی لڑکی دے دی۔"

مالی بولا " اے ، اب کب تک بچی کا منہ تنگ رہے گی۔ اے نہلاؤ دھلاؤ ، کپڑے پہناؤ۔"

محل میں اُس وقت طوفان چا تھا۔ یہ طوفان بادشاہ نے یحیح یحیح کر چلایا تھا۔ وہ کبھی پاؤں زمین پر مارتا، کبھی اپنے دانت چباتا ، کبھی ہوا میں گھوٹنے چلاتا۔ سب وزیروں اور درباری بادشاہ کو ٹھنڈا کرنے میں لگے تھے۔ مگر بادشاہ گرم ہوئے جا رہا تھا۔ آخر لوگوں نے سب سے بڑے وزیر کو بلوایا۔ وہ بہت بوڑھا تھا۔ لکڑی ٹیکتا محل میں آیا۔ سب قصہ سُنا ، بادشاہ کا حال آنکھوں سے دیکھا۔

بادشاہ نے بڑے وزیر کو دیکھتے ہی یحیح کر کہا " میں نے بہت صبر کیا۔ لیکن ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ اب میں اس عورت کو معاف نہیں کروں گا۔"

بادشاہ نے ”محل سے دُور، شہر سے پرے،
ایک کوٹھڑی بنواؤ۔ اُس میں نہ دروازہ ہو نہ کھڑکی۔ ملکہ
کو اُس کوٹھڑی میں بند کر دو۔“
بڑے وزیر نے کہا ”حضور، دروازہ کھڑکی نہیں ہو گا
تو ملکہ کو اندر کیسے ڈالا جائے گا؟“

”اوہو، چلو ایک دروازہ رکھ دو۔ ملکہ کو بند کر کے
اسے لکڑی کے تختوں سے بند کر دینا۔ ایک چھوٹی سی
کھڑکی بھی رکھ دینا۔ اس میں سے نوکر سُوکھی روٹی اور
پانی روز اندر رکھ دیا کرے گا۔ اس طرح ملکہ مرے
کی بھی نہیں اور سزا بھی بھگت لے گی۔“
”بجا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔“ بڑے وزیر نے کہا اور
لکڑی ٹیکتا ہوا واپس چلا گیا۔

چند ہی روز میں شہر کے باہر ایک کوٹھڑی بنا دی
گئی اور ملکہ کو اس میں بند کر دیا گیا۔ اس کی دونوں
ہنسیں دل ہی دل میں بہت خوش تھیں مگر محل کے نوکر
کئی دن تک روتے رہے۔ شہر والے بھی بہت
پریشان تھے۔

بڑے وزیر نے آنکھیں بند کیں، کچھ سوچا، پھر
آنکھیں کھولیں، چھت کی طرف دیکھا، فرش کی طرف
دیکھا۔ پھر بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا ”جو آپ
چاہیں گے وہی ہو گا۔ مگر یہ سُن لیجیے کہ خدا بھی آپ



کو مُعاف نہیں کرے گا۔ اور حضورِ والا، خدا کی مار
بہت سخت ہوتی ہے۔ میری مایہ۔ بلکہ کو ماریے
نہیں۔ کہیں باہر، محل سے دُور بھیج دیجیے۔“
سب درباریوں نے دل کر کہا ”یہ ٹھیک ہے۔“

رکھا اور دوسرے کا پرویز۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ ایسی جیسے کوئی پری۔ مائی نے اُس کا نام پری زاد رکھا، یعنی پری کی بیٹی۔ وہ لڑکی چرخ پری ہی تھی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ پہلے تو مالن مری اور کچھ دن بعد مائی بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ تینوں بچے یہی سمجھتے تھے کہ مائی ہمارے ماں باپ ہیں۔ مائی اور مالن نے انہیں بتایا ہی نہ تھا کہ وہ ان کے اصلی ماں باپ نہیں ہیں۔ کچھ عرصے بعد ایک بوڑھی عورت اس گھر میں آئی اور پری زاد سے بولی۔ ”تھارا مکان بہت

اچھا ہے، بس مین چیزوں کی کمی ہے۔“

پری زاد نے پوچھا ”کون سی چیزیں؟“

”بڑھیا بولی“ ایک تو بولنے والا پرندہ۔ دوسرا

گانے والا درخت اور۔۔۔ ”میسرا سنہری پانی۔“

پری زاد نے پوچھا ”اچھی نانی، یہ چیزیں کہاں سے مل سکتی ہیں؟“

”بوڑھی عورت نے سامنے والی سڑک کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ”اسی سڑک پر جاؤ۔ دس دن تک چلتی رہو۔ پھر



مائی اور مالن تینوں بچوں کو پالتے رہے۔ جب بچے بڑے ہوئے تو انہیں پڑھانے کے لیے ایک استاد رکھا۔ جب ذرا اور بڑے ہوئے تو اُن کو تلوار چلانی، گھوڑے کی سواری اور تیراکی سکھائی۔ جو بھی ان بچوں کو دیکھتا، مائی کی قیمت کی تعریف کرتا کہ خدا نے کتنے پیارے اور اچھے بچے دیے ہیں۔

مائی نے ان بچوں کے نام ایسے رکھے جو شاہی خاندان کے بچوں کے رکھے جاتے تھے۔ ایک لڑکے کا نام بہن

پھنس گیا ہوں۔“

نو دن تک بہمن سفر کرتا رہا۔ دسویں دن پہاڑ کے نیچے، ایک گھنے درخت کے سائے میں ایک بوڑھا پھونس فقیر ملا۔ اس کی ڈاڑھی سے لمبے اس کے سر کے بال تھے۔ بہمن اُسے دیکھ کر گھوڑے سے اُترا اور اُسے سلام کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا اور کہا ”آؤ پانی پیو سائے میں آرام کرو۔“

بہمن نے کہا ”بڑے میاں، مہربانی سے مجھے بتائیے کہ بولنے والا پرندہ، گانے والا درخت اور سُنہری پانی کہاں ملے گا؟“

بوڑھے نے کہا ”میں راستہ بتا دیتا ہوں مگر میری مانو تو یہ خیال چھوڑ دو۔ بہت سے نوجوان ان چیزوں کی تلاش میں آئے۔ میں نے راہ بتائی مگر وہ زندہ واپس نہ آئے۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ نہ جاؤ۔“

بہمن نے کہا ”آپ کی مہربانی، مگر مجھے راستہ بتا دیجیے۔ جانا ضرور ہے۔“

بوڑھے نے کہا ”تمہاری مرضی۔ یہ گیند تو۔ اسے سامنے

دہاں پہاڑ ملے گا۔ اس پہاڑ کے نیچے ایک بوڑھا شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہو گا۔ وہ تم کو بتائے گا کہ بولنے والا پرندہ، گانے والا درخت اور سُنہری پانی کس جگہ ہے؟“ یہ کہہ کر بوڑھی عورت پری زاد کو دُعاؤں دیتی ہوئی چلی گئی اور پری زاد دل میں سوچتی رہی کہ ایسی عجیب چیزیں ضرور لانی چاہئیں۔

شام کو دونوں بھائی، بہمن اور پرویز آئے تو پری زاد نے اُنھیں بوڑھی عورت کی باتیں سنائیں اور بولی:

”میں تو بولنے والا پرندہ، گانے والا درخت اور سُنہری پانی ضرور لاؤں گی۔“

بہمن نے کہا ”نہیں بہن، یہ کام میں کروں گا۔ کل صبح ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔“

دوسرے دن بہمن سفر پر جانے کو تیار ہو گیا۔ چلتے وقت اُس نے ایک تلوار پری زاد کو دی اور کہا ”بہن یہ تلوار اپنے پاس رکھو اور روز اسے دکھیتی رہو۔ جب تک اس میں چمک رہے، سمجھنا کہ میں اچھا ہوں۔ جب چمک جاتی رہے، زنگ لگنے لگے تو سمجھ جانا کہ میں مُصِیبت میں

دُور ہی چلا تھا کہ کالے کالے گول گول، بہت سے پتھر نظر آئے۔
بہمن نے پروا نہ کی۔ چلا رہا۔ اب پہاڑ سے پیچ نکلا
کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ مگر بہمن نے مڑ کر نہ دیکھا
لیکن جب اتنی زور زور سے آوازیں آنی شروع ہوئیں
کہ کان کے پردے پھٹنے لگے تو وہ گھبرا گیا اور پلٹ
کر دیکھا۔ بس جناب، پیچھے دیکھنا غضب ہو گیا۔ وہ بھی
ایک کالا پتھر بن گیا۔

جس دن بہمن گول کالا پتھر بنا، اُسی دن اُس کی
تلوار کی چمک جاتی رہی۔ اُس پر کالا کالا زنگ چڑھ گیا۔
پری زاد غم سے بڑھال ہو گئی۔ سمجھ گئی کہ اس کا پیارا
بھائی کسی مُصِیبت میں پھنس گیا ہے۔ اُس نے اپنا مُتھ
پیٹ لیا، رونے لگی اور کہنے لگی "ہائے میری قسمت،
میں نے اپنے ہاتھوں اپنے بھائی کو مُصِیبت میں پھنسیا۔
یہ دیکھ کر پرویز کہنے لگا "پیارے بہن، صبر کرو۔
میں کل ہی سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ بھائی
کو بھی ساتھ لاؤں گا اور تمہارے لیے بولنے والا
پرتدہ، گانے والا درخت اور سُنہری پانی بھی لاؤں گا۔"

چھینک دینا۔ یہ کڑھکتی جائے گی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے
رہنا۔ پہاڑ کے قریب یہ گیند رُک جائے گی۔ وہاں تم اپنے
گھوڑے سے اُتر جانا اور پہاڑ پر چڑھنا۔ جب تم پہاڑ
پر چڑھو گے تو بہت سے کالے پتھر دیکھو گے، گول گول۔
ان پر غور نہ کرنا۔ چلتے رہنا۔ پھر تمہارے پیچھے سے شور مچے
اُٹھے گا۔ طرح طرح کی آوازیں آئیں گی۔ کوئی تم کو واپس
بلائے گا۔ کوئی کہے گا، مجھے دیکھو۔ مگر تم پروا نہ کرنا۔
سامنے دیکھتے چلتے ہی رہنا۔ اگر پلٹ کر پیچھے کی طرف
دیکھو گے تو بڑی خرابی ہو گی۔ تم بھی کالا پتھر بن
جاؤ گے۔ اگر تم نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تو پہاڑ کی
چوٹی پر بولنے والا پرتدہ ملے گا۔ وہ تم کو گانے
والے درخت اور سُنہری پانی کا راستہ بھی بتا دے گا۔
بہمن نے بُوڑھے سے گیند لی، سلام کیا اور چل دیا۔
گیند چھینکی تو وہ پہاڑ کی طرف کڑھکتی چلی۔ بہمن نے
گھوڑے کو اس کے پیچھے رکھا۔ ایک جگہ پہنچ کر گیند
رُک گئی۔ بہمن گھوڑے سے اُتر گیا۔ یہیں سے پہاڑ کی
چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ بہمن نے چڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی

پرویز نے اپنے بھائی کا حال سنا کر کہا "میں اسی
کی فکر میں ہوں - میری بہن پری زاد کو بولنے والا
پرندہ ، گانے والا درخت اور سُنہری پانی حاصل
کرنے کا بڑا ارمان ہے - سنا ہے تم راستہ بتا
سکتے ہو -"

بُوڑھے نے کہا "ہاں ، کئی دن ہوئے تھواری
شکل کا ایک نوجوان آیا تھا - میں نے اُس کو
منع کیا تھا کہ اُن چیزوں کے لینے کی کوشش
نہ کر مگر جوان لوگ بُوڑھوں کی کب سُنتے ہیں -
وہ نہ مانا - میں نے راستہ بتا دیا - معلوم ہوتا ہے
وہ بھی کالا پتھر بن گیا ہے -"

بُوڑھے نے پرویز کو بھی منع کیا کہ پہاڑ پر
جانے کا خیال چھوڑ دے مگر پرویز نہ مانا -
"تم بابا ، مجھے راستہ بتا دو - پھر میں جانوں میرا
کام - تھواری عمر زیادہ ہے اس لیے سمجھتے ہو کہ
عقل بھی زیادہ ہے - یہ درخت جس کے نیچے تم
بیٹھے ہو ، دو سو سال پُرانا ہے - کیا اس کا مطلب

دوسرے دن پرویز نے سفر کی تیاری کی - جاتے وقت
پری زاد کو موتیوں کی ایک مالا دی اور کہا -
"اچھی بہن ، موتیوں کی اس لڑی کو اپنی انگلی سے
پھراتی رہنا - جب تک موتی آگے پیچھے ہوتے رہیں
سمجھنا میں اچھی طرح ہوں - موتی پھنس جائیں تو سمجھ
لینا کہ میں کسی مُصیبت میں پھنس گیا ہوں -" اُس
نے یہ کہا اور گھوڑے کو اڑ لگائی - یہ جا اور
وہ جا -

دسویں دن پرویز بھی پہاڑ کے قریب ، سایہ دار
درخت کے نیچے پہنچ گیا ، جہاں وہی بُوڑھا اپنی لمبی
ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو سلجھا رہا تھا -
پرویز نے کہا "بابا جی ، ان بالوں میں جوئیں پڑ گئی
ہوں گی - کیا صورت تم نے بنائی ہے - کاٹو انھیں -"
بُوڑھا بولا "اے جوان ، اپنا مطلب بتا - تجھے ان
بالوں سے کیا ؟ ہزاروں جوان ، پہلوان ادھر آئے ،
کسی نے ایسی بات نہ کہی - واہ بھئی وا - مان
نہ مان ، میں نیل مہمان - بولو ، کیسے آئے ؟"

پری زاد سمجھ گئی کہ دوسرے بھائی پر بھی کوئی آفت
آئی۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

لڑکی بہت والی تھی۔ اُس نے سفر کی تیاری کی۔
گھوڑا لیا اور چل پڑی۔ دسویں دن اُسی سایہ دار
درخت کے نیچے جا پہنچی جہاں وہی بوڑھا آگ پر
پرندوں کا گوشت سینک رہا اور مزے لے لے
کر کھا رہا تھا۔ پری زاد نے گھوڑے سے اتر
کر بوڑھے کو سلام کیا۔ بولی "دادا جان، میں اپنے
بھائیوں کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ ادھر آئے تھے
اور گھر نہیں پہنچے۔"

بوڑھے نے کہا "بیٹی آؤ، ناشتا کرو۔ سانس لو۔
وہ تمھارے ہی بھائی ہوں گے۔ میں نے اُن کو
سمجھایا تھا کہ بولنے والے پرندے، گانے والے
درخت اور سُنہری پانی کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں
مگر وہ نہ مانے۔ چھوٹا بھائی بہت تک چڑھا تھا۔
وہ مجھ سے بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔"
پری زاد بولی "میں ان کو لینے آئی ہوں۔ اگر

یہ ہے کہ یہ بہت عقل مند ہے؟"
بوڑھا بولا "نہ بیٹا، تو ہی بہت عقل مند ہے۔
یہ گیند لو۔ اسے لڑھکاؤ اور اس کے پیچھے چلو۔
جب یہ رُک جائے، گھوڑے سے اتر جانا۔ پہاڑ
پر چڑھنا شروع کرنا۔ وہاں بہت سے کالے پتھر
پلیں گے، گول گول۔ اُن سے مطلب نہ رکھنا اور
چلتے رہنا۔ پھر پیچھے سے شور و غل اُٹھے گا۔ مگر تم
سیدھے چلتے رہنا۔ اگر پیچھے پلٹ کر دیکھ لیا تو
قصہ ختم۔ تم بھی کالے پتھر بن جاؤ گے۔ کچھ دُور
جا کر بولنے والا پرندہ ملے گا۔ وہی تمھیں گانے
والے درخت اور سُنہری پانی کا پتا بتائے گا۔"
پرودیز نے گیند لے لی اور چل دیا۔ جو بہن پر
گُزری تھی وہی اُس پر گُزری۔ پہاڑ سے ایسی خوفناک
آوازیں آئیں کہ پرودیز گھبرا گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے
مڑ کر دیکھنا تھا کہ وہ بھی گول پتھر بن گیا۔
اسی دن پری زاد نے موتیوں کی مالا کو اٹھایا اور
موتیوں کو آگے پیچھے کرنا چاہا تو وہ نہ ہلے۔



بولنے والا پرندہ ، گانے والا درخت اور سنہری پانی
بھی بل گیا تو وہ بھی لے لوں گی ۔
بڑھے نے اس سے بھی وہی کچھ کہا جو اس کے
بھائیوں سے کہا تھا ۔ ایک گیند اُسے بھی دے دی ۔
پری زاد نے گیند لٹھکائی اور گھوڑا اس کے پیچھے
دوڑا دیا ۔ جب گیند رگ گئی تو وہ بھی گھوڑے سے
اُتر گئی اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا ۔ اس دفعہ
بھی وہی ہوا جو پہلے ہوا تھا ۔ بہت شور مچا ۔
ڈراؤنی آوازیں آئیں ۔ چیخ پکار ہوتی رہی مگر پری زاد
نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا ۔

آخر وہ پہاڑ کی حوٹ پر پہنچ ہی گئی ۔ دیکھتی کیا
ہے کہ ایک درخت کی ٹہنی میں ایک پنجرہ لٹک رہا
ہے ۔ پنجرے میں ایک پرندہ بیٹھا ہے ۔ پری زاد
پنجرے کے قریب گئی اور بولی ” میاں مٹھو ، اب تم
میرے ہو ۔“

پرندہ کچھ طوطے کی شکل کا تھا ۔ پری زاد کی بات
سن کر بولا ” ہاں شہزادی ، میں آپ کا غلام ہوں ۔“

ایک شاخ توڑی اور پانی کی چھاگل کندھے پر لٹکا کر چلی۔ اُس نے جس پتھر پر پانی کی بوند ٹپکائی، وہ آدمی بن گیا۔ پھر جب پری زاد نے دو پاس پاس کے پتھروں پر جادو کا پانی ٹپکایا تو کیا دیکھتی ہے کہ بہن اور پرویز کھڑے ہیں۔ دونوں بھائی خوشی سے اُچھلے اور بہن سے رپٹ گئے۔ پری زاد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے بھائی بھی مل گئے اور وہ تین چیزیں بھی جن کی اُسے اتنی تمنا تھی۔

پری زاد نے بولنے والے پرندے کا پنجر، بہن نے سنہری پانی کی چھاگل اور پرویز نے گانے والے درخت کی شاخ ہاتھ میں لی اور واپس لوٹے۔ پری زاد کے ساتھ وہ سب لوگ بھی ہو گئے جو پتھر سے آدمی بنے تھے۔ یہ سب اپنے اپنے شہر کی طرف چلے گئے۔ اب صرف دونوں بھائی اور اُن کی بہن پری زاد رہ گئے۔ جب ان کا شہر قریب آیا تو اُن کو بادشاہ شکار کو جاتا ہوا ملا۔

فرمائیے، کیا محکم ہے؟
پری زاد خوش ہو گئی۔ بولی "بتاؤ، گانے والا درخت، اور سنہری پانی کہاں ہے؟"
پرندہ کہنے لگا "ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھیے۔ وہ درخت گانا گاتا ہے۔ اس کے آگے پانی کا چشمہ ہے، وہاں سے آپ اپنی چھاگل بھر لیجیے۔"
پری زاد جھٹ پٹ اس درخت کے پاس گئی۔ درخت نے ایسا بیٹھا گانا سنایا کہ وہ جھوم جھوم گئی۔ پھر وہ چشمے کے پاس گئی۔ اپنی چھاگل لبالب بھر لی اس کے بعد پرندے کا پنجر اُٹھایا اور اس سے کہا "میرے پیارے پرندے، میرے دو بھائی یہاں کالا پتھر بن گئے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتا جس سے وہ اپنی اصلی صورت میں آجائیں۔"

"بہت بہتر" پرندہ بولا "میرے پنجرے میں پیالہ رکھا ہے۔ اس میں جادو کا پانی ہے۔ آپ اس پانی کی بوند کالے پتھروں پر ٹپکا دیں۔ پھر تماشا دیکھیں۔"
پری زاد نے پنجر اُٹھایا، گانے والے درخت کی



بادشاہ لڑکوں کو دیکھ کر ہک دک رہ گیا۔ اس نے
دونوں بھائیوں سے کہا، ”میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔
میرے محل میں چلو۔ میں تم سے باتیں کروں گا۔“
بہن اور پرویز بادشاہ کے ساتھ جانا نہیں چاہتے
تھے۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ پرندہ پنجرے میں
سے بولا ”چلے جائیے، چلے جائیے اور دوسرے دن
بادشاہ سلامت کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیجیے۔“
بہن اور پرویز بادشاہ کے ساتھ چلے گئے۔ پری زاد
پرندے، گانے والے درخت کی شاخ اور سنہری پانی
کی چھاگل لے کر گھر آ گئی۔
پرندہ بولا ”سنہری پانی کی دو بوتلیں ٹپکا دو۔ دو
فوارے جاری ہو جائیں گے۔ اس فوارے کے پانی
کو سارے گھر میں چھڑک دو۔ دیکھنا کیا مزہ آتا ہے۔“
پری زاد نے ایسا ہی کیا۔ واہ، واقعی مزہ آ گیا۔
دو فوارے چھوٹے، جن کا خوش بو دار پانی ایک ایک
بانس اُچھلنے لگا۔ جب پری زاد نے یہ پانی گھر میں
چھڑکا تو وہاں ایسی عمدہ چیزیں رکھی نظر آئیں جو صرف

بہنچے تو وہاں کا سامان، ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ دسترخوان بچھا تو بادشاہ کے آگے موتی بھری لکڑیوں کی رکابی رکھی گئی۔ کھانا کھاتے کھاتے بادشاہ نے لکڑی کی رکابی میں نوالہ توڑا تو اُس میں سے موتی نکلے۔ بادشاہ نے کہا:

”کہیں انسان موتی بھی کھاتے ہیں؟“

پنجرے میں سے پرندہ بولا ”واہ حضور، کہیں انسان کے ہاں جانوروں کے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں؟“ بادشاہ نے پنجرے کی طرف دیکھ کر کہا ”میں نے اس لیے یقین کر لیا تھا کہ ملک کی بہنوں نے کہا تھا“ پرندہ بولا ”بھولے سرکار، وہ دونوں ملک سے حسد کرتی تھیں۔ وہ اُس کی دشمن تھیں۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ یہ دونوں لڑکے اور یہ لڑکی آپ ہی کے بچے ہیں۔ ان کو پیدا ہوتے ہی ان کی ظالم خالہ نے دریا میں بہا دیا تھا۔“ بادشاہ خوشی سے اچھل پڑا۔ باری باری بہنوں کو گلے لگایا، پیار کیا۔ مگر پھر ہاتھوں سے منہ چھپا لیا

بادشاہوں کے محل میں ہوتی ہیں۔ شام کو بہن اور پرویز محل سے واپس آئے تو اپنے گھر کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے بہن سے کہا ”یہ سب تو ٹھیک ہے۔ کل بادشاہ سلامت یہاں آئیں گے۔ ان کی دعوت ایسی ٹھاٹ دار ہونی چاہیے کہ وہ خوش ہو جائیں۔“

پرندہ پھر بولا ”ہاں، خوب مزے دار کھانے پکانا۔ ایک چیز میری خوشی کی پکائیے۔ لکڑی کے اندر موتی بھر کر تلنا۔ بادشاہ سے کہنا کہ حضور، پہلے یہ چیز کھائیے۔“

پری زاد نے کہا ”ارے، کوئی موتی بھی کھاتا ہے؟“ پرندہ کہنے لگا ”اسے بھوڑیے۔ میری بات مانیے اور پھر تماشا دیکھیے۔“

دوسرے دن بادشاہ، اُس کے وزیر اور درباری بہن کے گھر آئے۔ باغ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فوارے کے پانی کی خوشبو نے سارے باغ کو مہکا دیا تھا۔ ایسی خوشبو درباریوں نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ گھر میں

اور کہا "مائے! میں کتنا ظالم ہوں۔ تمھاری غریب ماں کو
میں نے بہت دکھ دیا۔ ابھی چلو۔ اُس کو قید سے
نکالیں۔"

بادشاہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بہن، پردیوز
اور پری زاد کو لے کر اُس کو ٹھٹھری کے پاس پہنچا جس
میں ملکہ قید تھی۔ ملکہ نے اپنے بچوں کو دیکھا تو سارا
دُکھ بھُول گئی۔ چٹ چٹ بلائیں لیں۔ چوما، پیار کیا۔
پھر وہ سب محل میں آ گئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔

معروف موی

یہ قصہ مُک مصر کے ایک شہر قاہرہ کا ہے۔ قاہرہ
بہت بڑا شہر ہے۔ کسی زمانے میں وہاں ایک لڑکا رہتا
تھا۔ نام تھا



معروف،
معروف کا باپ
موی تھا۔ اچھے
پیسے کما لیتا
تھا۔ اُس نے

بیٹے کو بھی یہ مہنہ سکھانے کی کوشش کی مگر وہ

کہ گرنے کے قریب - اندھیرا گھپ اور سخت بدبو۔
بُست ہی گندی اور خراب جگہ تھی - معروف نے
سوچا، رات تو یہاں گزاروں، صُبح دیکھی جائے گی۔
وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم اُجالا ہوا۔
چھت پھٹی اور ایک بہت بڑا سر اس میں سے نکلا۔
یہ ایک جن کا سر تھا - جن نے پوچھا ”اے انسان،
تو یہاں کیوں آیا؟ دو سو برس سے میں اس مکان
میں ہوں - آرام سے رہتا ہوں - تو کون ہے جو
بلا اجازت یہاں چلا آیا ہے؟

معروف نے اسے اپنا قصہ سنایا - جن کو اس پر
رحم آ گیا - بولا،

”میں تجھے ایک ایسے ملک میں لے جاؤں گا،
جہاں تیرے دن پھر جائیں گے - تو دولت میں
کھیلے گا - آ میری کمر پر بیٹھ جا۔“

معروف نے جن کا حکم مانا - جن نے شوں کی
سی آواز نکالی اور اُوپر اُڑا اُڑا چلا گیا - اندھیری
رات میں معروف کو کچھ نظر نہ آیا - وہ جن کی کمر

بڑا کام چور اور نکما تھا - اُس نے سیکھ کر نہ دیا -
دن کھیل کود میں گنوا دیتا اور رات کو اُلٹے سیدھے
خواب دیکھا کرتا - شیخ چلی کے سے خواب -

خیر صاحب، جب تک باپ زندہ رہا، دال روٹی
چلتی رہی - وہ مرا تو فاقوں تک نوبت آ گئی -
معروف کا دُنیا میں اور کوئی نہ تھا - بس ایک بڑھیا
ماں تھی - اُس نے پہلے تو گھر کا سامان بیچ کر کام
چلایا - جب بیچنے کو تنکا تک نہ رہا تو معروف
سے کہا، کوئی کام کر - ورنہ دونوں بھوکوں مر
جائیں گے -

معروف گھر سے نکلا کہ کوئی کام ملے تو کرے -
پھرتا پھرتا دُور نکل گیا - اتنے میں زور کی آندھی آئی
اور مینہ برسنے لگا - معروف بھیگ گیا - سر سے
پیر تک - وہاں سے بھاگا - اب وہ شہر سے باہر
تھا - ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی نظر آئی - اُسی میں گھس
گیا - کوٹھڑی کی چھت میں پیسوں چمکادڑیں لٹک رہی
تھیں - کڑیاں تک جھک گئی تھیں - دیواریں اتنی پرانی

معروف نے جواب دیا ”میں قاہرہ سے آیا ہوں۔“
اس پر بوڑھے ہنسنے لگے۔ ”پوچھا کب آئے؟“
معروف نے کہا ”آج صبح۔“
”قاہرہ سے کب چلے تھے؟“
”کل رات۔“

بوڑھے ہنس پڑے۔ ایک نے کہا ”ارے، بے چارہ
پاگل ہے۔“ دوسرے نے کہا ”جھوٹا ہے۔ بھلا قاہرہ کہاں
اور یہ جگہ کہاں؟ ایک سال میں آدمی وہاں سے یہاں
آتا ہے۔“

معروف چپ ہو رہا۔ لوگ اسے چھیڑتے رہے۔ تب
ایک سوداگر رشیم کا لباس پہنے، آگے بڑھا اور بولا۔
”مسافر کو ستانا بڑی بات ہے۔ جاؤ، اپنا کام کرو۔“
یہ سوداگر ایک خچر پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ چار
غلام تھے۔ چاروں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ سوداگر
نے معروف سے کہا ”میرے ساتھ آؤ۔“ معروف اُس کے
پیچھے پیچھے چلا۔
کچھ دور چل کر ایک بہت شان دار مکان میں سوداگر

پر آرام سے بیٹھا رہا۔ صبح ہونے کو ہوئی تو جن ایک



شہر میں اُترا اور معروف سے کہا ”یہ شہر بہت بڑا
ہے۔ یہاں کے لوگ اچھے ہیں۔ جاؤ، قیمت آزاد
میں اپنے گھر جاتا ہوں۔“

معروف شہر میں آیا۔ یہ شہر قاہرہ سے چھوٹا تھا
مگر اس کے مکان اور بازار بہت شان دار تھے۔
ہر مکان میں باغ تھا۔ سڑکیں صاف ستھری اور دکانیں
سجی ہوئی تھیں۔ معروف کو دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ
لگ گئی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب ہی کھڑے ہو
گئے۔

”اے بندے، تو کون ہے؟“ ایک شخص نے پوچھا۔

داخل ہوا۔ اُس نے معروف کو کھانا کھلایا۔ بعد میں اُس کا حال پوچھا۔ معروف نے سارا قصہ سنایا۔ سوداگر نے کہا ”اچھا، قاہرہ میں تم کس گلی میں رہتے تھے؟“

”میرا گھر گلی سرفاب میں تھا۔“

”تھارے پڑوسی کون تھے؟“

معروف نے کئی پڑوسیوں کا نام پتا بتا کر کہا: ایک میرے پڑوسی حمید عطر والے ہیں۔ بہت مہربان۔“

”اُن کا کیا حال ہے؟ زندہ ہیں؟“

”ہاں، زندہ ہیں۔ بہت اچھی طرح ہیں۔ اب ان کا

بڑا بیٹا محسن عطر کی دکان پر بیٹھا ہے۔ افسوس کہ ان کا چھوٹا بیٹا مسلم بچپن میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میں اور وہ روز گلی میں کھیلا کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کہاں گیا۔“

سوداگر نے یہ سن کر، معروف کو گلے لگایا اور کہا: ”دوست، وہ مسلم ہیں ہوں۔ بچے پکڑنے والے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے۔ بہت دُور لے جا کر بیچا۔ جب میں جوان ہوا تو بھاگ کر یہاں آ گیا۔“

پچھڑے دوست مل کر بہت خوش ہوئے۔ مسلم نے بتایا کہ اس ملک کا نام چیتان ہے۔ خدا نے مجھ پر مہربانی کی۔ اب میں ایک مال دار سوداگر ہوں۔ پھر اُسے سمجھایا کہ دیکھو، اپنا قصہ کسی کو نہ سنانا۔ اگر اپنے موبی ہونے کی بات یا جن کی کہانی سناؤ گے تو لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ اب ہم دوست بن کر رہیں گے۔ یہاں میری عزت کی جاتی ہے۔ بادشاہ تک میری قدر کرتا ہے۔ اب جیسا میں کہوں ویسا کرو۔ چند روز میں مالا مال ہو جاؤ گے۔“

معروف نے پوچھا ”کیسے مالا مال ہو جاؤں گا، یہ بھی تو بتاؤ؟“

سوداگر نے کہا ”اب تم آرام کرو۔ کل میں تم کو ایک ترکیب بتاؤں گا۔ اُس پر عمل کرنا۔ بہت مزے میں رہو گے۔ میں جب اس شہر میں آیا تھا، بالکل فقیر تھا۔ ترکیب سے کام لیا۔ اب دیکھو۔ یہ مکان ہے، نوکر ہیں، کئی غلام ہیں۔“

معروف نے رات بڑے آرام سے کاٹی۔ صبح ناشتا

دوسرے سوداگر بھی یہی کریں گے۔
”سنو، کان کھول کر سنو۔ ریگستان کو سوداگر جلدی



طے کر لیتے ہیں۔ ان کا مال اسباب، اُونٹوں پر، بعد
میں آتا ہے۔ کئی دن بعد۔

”میں سوداگروں سے کہہ دوں گا کہ معروف سوداگر
کا مال راستے میں ہے۔ آنے والا ہی ہو گا۔ تم انہیں
بتانا کہ تمہارے قافلے میں دو ہزار اُونٹ ہیں اور سب
پر سامان لدا ہوا ہے۔ میں تم سے پوچھوں گا،
کیوں صاحب، آپ کے مال میں ریشمی تھان بھی ہیں کیا؟
تم کہنا، بہت، بہت زیادہ۔
”اچھا، یہ ہزار اشرفیاں ہیں نا۔ ان اشرفیوں سے تم

کر کے بیٹھا ہی تھا کہ مسلم سوداگر ریشم کا لباس اور ایک
بہت قیمتی پگڑی لایا۔ بولا،
”دوست، لو یہ لباس پہنو، پگڑی باندھو۔ یہ تھیلی
لو۔ اس کے اندر پوری ایک ہزار اشرفیاں ہیں۔ کم
نہ زیادہ۔“

معروف نے لباس پہن لیا اور تھیلی ہاتھ میں لٹکالی۔
مسلم نے کہا ”ابھی نھوڑی دیر میں ایک خچر آئے گا۔
اس پر شان سے بیٹھ جانا۔ خچر کے ساتھ ایک غلام
ہو گا۔ وہ تمہارا نوکر ہے۔ جو کہو گے، وہی کام
کرے گا۔“

”خچر پر بیٹھ کر، اشرفیوں کی تھیلی غلام کے ہاتھ میں
دے دینا اور کپڑے کے بازار میں جانا۔ وہاں ایک
بڑی سی دکان میں، کئی سوداگر بیٹھے ہوں گے۔ میں بھی
ایک تیکے پر کمر لگا کر بیٹھا نظر آؤں گا۔ میں دوسرے
سوداگروں کے کان میں کہوں گا کہ یہ قاہرہ کا بہت
بڑا سوداگر ہے۔ اس کے کپڑے کے کئی کارخانے
ہیں۔ پھر میں تم سے ہاتھ ملاؤں گا۔ خیریت پوچھوں گا۔“

وہاں اور بھی کئی سوداگر بیٹھے تھے۔ سب اُٹھے، جھک کر سلام کیا، مُصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔ معروف نے کسی کے سلام کا جواب دیا، کسی کو ٹال دیا۔ کسی سے مُصافحہ کیا، کسی سے نہ کیا۔ مُسلم سوداگر نے ایک ایک کے کان میں کھسر پھسر کی۔ پھر معروف کو عزت سے بٹھایا اور پوچھا ”میرے آقا، آپ کا مال کہاں ہے؟“

معروف نے جواب دیا ”آسمان کے نیچے، زمین کے اوپر یعنی صحرا میں چلا آ رہا ہے۔“

دوسرے سوداگر نے پوچھا ”کتنے اُونٹ ہیں آپ کے قافلے میں؟“

معروف نے کہا ”جب قافلہ آئے گا، گن لینا۔ راستے میں کئی اُونٹ مرجلتے ہیں۔ اب کون بتائے کتنے یہاں پہنچیں گے۔“

سوداگر گردن ہلا ہلا کر رہ گئے۔ ایک بوڑھا بولا۔

”عقل مند آدمی عقل مند ہی ہوتے ہیں۔“

مُسلم نے پوچھا ”میرے مہربان، کیا آپ کے مال میں ریشمی کپڑے کے تنہا بھی ہیں؟“

سوداگری کا سامان خریدنا۔ قالین، دریاں وغیرہ وغیرہ۔ خریداری میں ہوشیار رہنا۔ جب کوئی دس اشرفی دام بتائے تو تم سات کہنا۔ یا چلو آٹھ کہہ دینا۔“

”نہیں بھئی، میں تو ایک کہوں گا۔ اشرفی تو سونے کی ہے نا“ معروف نے کہا۔

مُسلم نے اپنے ماتھے کو رُومال سے پونچھا اور کہنے لگا ”اچھا، میں اس میں بھی تمھاری مدد کروں گا۔ خریدنا، بیچنا سکھاؤں گا۔ میں تم کو ہوشیار سوداگر بنا دوں گا۔ اور سُنو۔ جب تمھارا قافلہ ایک مہینے کے بعد بھی نہ پہنچے تو تم بتانا کہ وہ راستے میں لٹ گیا۔“

اب سُنو۔ بازار میں کپڑے کے بڑے بڑے سوداگر بیٹھے تھے کہ جناب معروف، ریشم کے کپڑے پہنے، زری کی پگڑی باندھے، وہاں پہنچے۔ سلام نہ دُعا، جھومتے ہوئے ایک بڑی سی دُکان میں گھس گئے۔

مُسلم سوداگر ایک گاؤ تیکے پر ایسے بیٹھا تھا جیسے وہ یہاں کا بادشاہ ہے۔ معروف کو آنا دیکھ کر اُٹھا، جھک کر سلام کیا اور دونوں ہاتھ مُصافحے کو بڑھائے۔

چیتان میں معروف کا نام دو دن میں مشہور ہو گیا۔ سوداگر، ہریاری، دکان دار، فقیر، ہر شخص کہتا تھا کہ معروف کے برابر سوداگر دُنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ فقیروں کو دینے کے لیے معروف جس سوداگر سے رقم قرض مانگتا، وہ فوراً دے دیتا۔ مسلم سوداگر نے یہ حال دیکھا تو بہت گھبرایا۔ شام کو معروف کو اپنے کمرے میں لے گیا اور کہا ”یہ تم نے کیا گڑ بڑ کر رکھی ہے؟ یہ روپیہ جو تم قرض لے رہے ہو، اسے واپس کیسے کرو گے؟“ معروف نے جواب دیا ”کیوں، ادا کرنا کیا مشکل ہے؟ جب میرا قافلہ، ہزار دو ہزار اُونٹوں کا، مال سے بھرا ہوا یہاں پہنچے گا تو سارا قرض ادا کر دوں گا۔“ مسلم نے ناک چڑھا کر کہا ”کیسا قافلہ؟ کہاں کا قافلہ؟ کوئی قافلہ نہیں آ رہا۔“

معروف نے تعجب سے کہا ”یہ تم کیا کہتے ہو؟ کیوں نہیں آ رہا؟ واہ۔ بہت لمبا قافلہ ہے۔ اُونٹ کے پیچھے اُونٹ۔ سب آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں۔“

ایک ہفتے کے اندر اندر معروف چیتان کے سوداگروں

”کیا چیز؟ اچھا ریشمی تھان؟ وہ تو بے شمار ہیں۔“

معروف نے کہا۔

دوسرے سوداگر نے بوجھا ”مخل بھی ہو گی؟“

معروف نے کہا ”مخل کیوں نہ ہوتی۔ مخل کے تو میرے تین کارخانے ہیں۔ چونٹھا واپس جا کر بناؤں گا۔“

اب تو سوداگروں کو پکا یقین ہو گیا کہ یہ بہت بڑا سوداگر ہے۔

اب تک سب باتیں مسلم کو خوش کرنے والی ہوئیں۔ ہاں ایک بات پر وہ ذرا گھبرایا۔ بات یہ ہوئی کہ ایک فقیر، جھولی بغل میں دابے آگیا اور اللہ کے نام پر بھیک مانگی۔ کسی نے پتیل کا ایک سکہ دیا، کسی نے دو دیے، کسی نے ”معاف کر“ کہا۔ جب یہ فقیر معروف کے پاس آیا تو اُس نے اشرفی کی تھیلی کھولی اور مٹھی بھر کر فقیر کی جھولی میں ڈال دی۔

اب تو فقیروں کی بھڑگھس آئی۔ معروف نے سب کو مٹھی بھر بھر کر اشرفیاں دیں۔ جب تھیلی خالی ہو گئی تو ایک فقیر کو خالی تھیلی دے دی۔

بُت کنبوس تھا۔ لالچی تھا۔ ہر وقت سونا چاندی جمع کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کے پاس کروڑوں روپے کا سونا تھا مگر پھر بھی یہی چاہتا تھا کہ اور آجائے اس کو مرنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ بس سونا اکٹھا کرنے کی دھن تھی۔ اسی فکر میں وہ بُت موٹا ہو گیا تھا۔ اب جو بادشاہ نے سنا کہ ملک مصر کا ایک بڑا امیر سوداگر جو کئی کارخانوں کا مالک ہے، یہاں آیا ہے، فقیروں میں اشرافیاں بانٹ رہا ہے اور کئی ہزار اونٹ اُس کا مال اسباب، سونا چاندی لیے ہوئے آ رہے ہیں تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے سوچا کہ یہ سارا مال کسی طرح میرے ہتھے چڑھ جائے تو بس مزے آ جائیں۔ اُس نے زور سے کہا "ارے، کوئی ہے؟"

کئی آوازیں آئیں "خادم حاضر ہیں حضور۔"
دو غلام کمر میں تلوار باندھے، وردی پہنے آ گئے۔
بادشاہ نے کہا "مصر کا ایک سوداگر ہمارے شہر میں آیا ہے۔ اُسے فوراً حاضر کرو۔"

سے پچاس ہزار اشرافی قرض لے کر فقیروں میں بانٹ چکا تھا۔ اُس نے سوداگری کا سامان نہیں خریدا، جیسا کہ اس کے دوست مُسلم نے کہا تھا، اور سارا روپیہ یوں ہی اڑا دیا تھا۔

معروف کا جواب سُن کر مُسلم کو غصہ آ گیا۔ کہا: "تم احمق ہو۔ ہوش میں آؤ۔ اگر تم اسی طرح قرض لیتے رہے اور فقیروں کو بانٹتے رہے تو پھر مجھے سوداگروں سے کہنا پڑے گا کہ معروف قاہرہ کا موچی ہے۔ وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔"

معروف نے کہا "ضرور کہہ دو۔ مگر یاد رکھو، تم ہی نے سوداگروں سے کہا تھا کہ معروف قاہرہ کا بڑا سوداگر ہے۔ ہزاروں اونٹ اس کا مال اسباب لے کر پہنچنے والے ہیں۔ مگر میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم نے یہ کیسے جانا کہ میرا قافلہ نہیں آ رہا؟ یہ تم کیسے کہتے ہو کہ میں جھوٹا منکار ہوں؟" یہ سُن کر مُسلم بھٹکا گیا اور اپنا سر نیچتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔
اب ایک لطیفہ سُنو۔ اس ملک، چیتان، کا بادشاہ

”سُنے جناب - پائے سونے کے ہیں اور پٹیاں چاندی کی۔ سونے کے تانگوں سے اُنھیں بُنا گیا ہے۔“
بادشاہ یہ سُن کر خوشی سے چھولا نہ سمایا اور دل ہی دل میں معروف کی دولت پر قبضہ جمانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

بادشاہ نے معروف کو بڑی عزت سے مُنحست کیا اور پھر اپنے وزیر کو مُبلایا۔ اُس نے وزیر سے کہا:



”اے وزیر باتبیر، ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سونے کی چڑیا کسی دوسرے کے ہاتھ نہ لگے۔ ہم اسے پھانسلیں۔ یہ پردیسی بہت بڑا سوداگر ہے۔ اس کے قافلے میں سونے کے پلنگ تک ہیں۔ ہیرے، جواہرات اور ریشم

غلام گھوڑوں پر بیٹھے فوراً مُسلم کے گھر پہنچے اور معروف کو کپڑے کر شاہی محل میں لے آئے۔ بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا۔ دربان نے معروف کو اندر دھکا دے کر کہا ”ادب سے، نگاہ نیچے۔“ بادشاہ حضور کو آداب بجا لاؤ۔“

معروف نے بادشاہ سے کہا ”میں قاہرہ کا سوداگر ہوں۔ میرے تین کارخانے محل کے کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔ چوتھا واپس جا کر بناؤں گا۔“
بادشاہ نے پوچھا ”تمہارے قافلے میں ریشم کے کپڑے ہیں؟“

”بہت۔ بہت زیادہ۔“

”چاندی کے برتن بھی؟“

”بہت، بہت کافی۔“

”سونے کے پلنگ؟“

”سونے کے پلنگ؟ پلنگ پر ہی تو لوگ سوتے ہیں۔“

”ہمارا مطلب ہے، کیا وہ سونے کے بنے ہوئے ہیں؟“

وزیر "بجا، درست" کہتا ہوا چلا گیا۔ اب بادشاہ نے معروف کو بلوایا اور اُس سے کہا "اے سوداگر، تم ہمیں بہت پسند آئے ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی اپنی بیٹی یاسمین سے کر دیں۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تم تیار ہو تو کل ہی دُلہا بن کر ہمارے محل میں آ جاؤ۔"

معروف کا دل چاہا کہ وہ ناچنے لگے۔ مگر بادشاہ کے در سے چُپ رہا اور گردن جھکا کر بولا "جیسی حضور کی مرضی۔ میری کیا مجال کہ انکار کر سکوں۔"

تو صاحب، دوسرے دن یاسمین دُلہن بنی، معروف دُلہا بنا۔ شادی ہو گئی۔ محل میں خوب گانا بجانا ہوا اور سارے شہر میں مٹھائی بٹی۔ غریب لوگ خوشی سے سڑکوں پر نلچتے رہے اور معروف زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔ مگر معروف کا دوست مُسلم سوداگر چُپ تھا۔ کسی سے بات ہی نہ کرتا تھا۔ دو تین دن اپنے گھر میں لیٹا رہا۔ اس کے پسینے بہتے رہے۔ چیتان میں صرف اسی کو معلوم تھا کہ معروف سوداگر نہیں، ایک غریب موچی ہے۔

کے تھانوں کا حساب بے حساب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بیٹی یاسمین کی شادی اس سوداگر سے کر دیں۔" وزیر نے اپنی مونچھ ذرا سی اوپر کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا:

"عالی جاہ، معلوم نہیں یہ کون ہے۔ یونہی، بے جانے بوجھے، شہزادی کی شادی اس سے کر دینا کچھ مُناسِب معلوم نہیں ہوتا۔"

بادشاہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔ بولا "تم چاہتے ہو ہم اپنی یاسمین کی شادی معروف سے نہ کریں؟"

"جی، عالی جاہ"

"تم چاہتے ہو کہ ہم اپنی بیٹی کی شادی تمہارے بیٹے سے کر دیں؟"

"خدا عالی جاہ کو ایک ہزار سال زندہ رکھے۔ بڑا نیک خیال ہے۔"

بادشاہ نے ہاتھ ملے، اپنی ناک ملی اور کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قابل نہیں ہے۔ وہ نکمّا ہے اور بے وقوف بھی۔"

کچھ نہ کچھ انعام دیتا۔
شہر کے فقیر اور غریب معروف کو دعائیں دیتے۔ وہ اب



بھی محل کے دروازے پر آتے، معروف کی تعریف کرتے
اور اشرافی لے کر واپس جاتے۔ مگر کچھ لوگ اس شادی سے
پریشان بھی تھے۔ یہ تھے شہر کے سوداگر۔ وہ کہتے کہ اب
ان کا قرض کیسے وصول ہو گا۔ معروف محل میں رہتا ہے۔

معروف شہزادہ بن گیا

یاسمین بہت خوب صورت اور نیک لڑکی تھی۔ چہرہ ایسا
جیسے چودھویں کا چاند۔ مزاج ٹھنڈا۔ ہنس مکھ۔ خفا ہونا جانتی
ہی نہ تھی۔ لوگوں تک سے مسکرا کر بات کرتی۔
معروف کو شہزادی یاسمین بہت پسند آئی۔ یاسمین کو بھی
وہ اچھا لگا۔ وہ شہزادی کو ایسے ایسے قصے سناتا کہ وہ
ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ دن رات دونوں خوش
رہتے۔ یاسمین کو گانا بجانا بھی آتا تھا۔ ایسا ستار بجاتی کہ
معروف ستار کی تن تن پر جھوم جھوم جاتا۔ محل کے نوکر، خادم
سب اس جوڑے سے خوش تھے۔ معروف روز ان کو

نے اُس سے پوچھا:
”شہزادہ معروف نے اب تک کتنا روپیہ خرچ کیا ہے؟“
خزائنچی نے عینک اُونچی کی۔ بادشاہ کو دیکھا پھر عینک
ناک کی چھنگ پر رکھی، بستہ کھولا، ہاتھ جوڑے اور کہا:
”حضرت مائی باپ، شہزادے نے ایک دن ایک سو نو
اشرفیاں لیں، دوسرے دن دو سو گیارہ، تیسرے دن دو سو
پچاس“

”آگے بتاؤ۔ چوتھے دن کتنی اشرفیاں لیں؟“
”چوتھے دن سے دسویں دن تک تین تین سو اشرفیاں
منگاتے رہے۔ گیارہویں دن گیارہویں شریف تھی۔ شہزادے
نے گیارہ سو کھارو حلوا کپوایا۔ غریبوں میں بانٹا۔ اس پر
آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہوا مائی باپ۔“
”بس بس۔ اب تم جاؤ۔“ بادشاہ نے دونوں ہاتھوں سے
سر پکڑ کر کہا۔ اُسے غش آنے لگا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ بادشاہ کی توند بچکنے لگی، فکر کے
مارے۔ فکر غلی معروف کے قافلے کی جو ابھی تک نہیں
آیا تھا۔ اب تو بادشاہ بہت گھبرایا۔ وزیر کو بلایا اور کہا

وہاں جا کر تقاضا نہیں کر سکتے تھے۔ مسلم سوداگر بھی اسی
غلم میں گھل رہا تھا۔
سب سے بڑا دشمن، معروف کا وزیر تھا۔ وہ بیسوں
سے اس اُمید میں تھا کہ اپنے بیٹے کی شادی یاسمین سے
رچائے گا۔ جب بادشاہ مر جائے گا تو اس کا بیٹا راج کرے
گا۔ معروف نے یہ سارا کھیل بگاڑ دیا۔ وزیر کا بیٹا اب
بادشاہ تو کیا، وزیر بھی نہیں بنے گا۔
بادشاہ نے معروف کو خوش کرنے کے لیے اپنے خزائنچی
سے کہہ دیا تھا کہ معروف جو کچھ مانگا کرے، دے دیا
کرنا۔ بادشاہ کو ہر صبح اُمید ہوتی کہ معروف کا قافلہ آج
پہنچے گا۔ اس کے قیمتی زیور قیمتی موتی اور مہمل کے تھان
وغیرہ وہ اپنے خزانے میں رکھوا دے گا۔ اس طرح ایک
اشرفی خرچ کر کے بیس اشرفیاں وصول کر لے گا۔ مگر قافلہ
چھوڑ، قافلے کی خبر تک نہیں آئی۔

ایک دن بادشاہ نے اپنے خزائنچی کو بلایا۔ وہ معلوم
کرنا چاہتا تھا کہ معروف اب تک کتنا روپیہ خرچانے سے
لے چکا ہے۔ خزائنچی بستہ بغل میں دابے آیا تو بادشاہ

وزیر نے کہا "شہزادی صاحبہ، آپ کے آبا حضور کا خزانہ خالی ہو رہا ہے۔ شہز کے سوداگر سرپیٹ رہے ہیں، معروف کی جان کو رو رہے ہیں۔ ایک سوداگر، جس کا نام مسلم ہے، گھبرا کر شہر چھوڑ گیا ہے کسی کھوہ میں جا چھپا ہے۔ اگر معروف کا صبح صبح حال نہ کھلا تو ہم سب پر مصیبت آ جائے گی۔"

شہزادی نے جواب دیا "میں نے سُن لیا، تم نے جو کہا۔ میں ایک دو دن کے اندر سارا حال معلوم کر لوں گی۔ نہ گھبراؤ۔ آرام سے گھر جاؤ۔"

اُس رات یاسمین نے معروف کو بہت مزے مزے کے کھانے کھلائے۔ خوب دل لگا کر بتا بھایا۔ جب معروف مست ہو گیا تو شہزادی نے کہا:

"میرے سرتاج، تم کو مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ ذرا سی بھی کوئی بات ہو تو فوراً مجھے بتا دینا۔"

معروف نے کہا: "کیسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے اور شکایت تو بہ، تو بہ۔ ایسی بات سوچنا بھی مت سمجھی۔"

شہزادی بولی "اچھا، میں جو بات پوچھوں گی، اُس کا

"شہزادے کے یہی لپٹن رہے تو ایک دن سارا خزانہ خالی ہو جاتے گا۔ تم ہی بتاؤ کیا کروں؟ وہ قافلہ تو ابھی تک نہیں آیا۔"

وزیر نے کہا "حضور، مجھے تو دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ آپ شہزادی صاحبہ سے کیے۔ وہ کسی ترکیب سے شہزادے سے معلوم کر لیں، کیا سچ سچ قافلہ آ رہا ہے یا بڑی گپ ہے؟"

بادشاہ نے یاسمین کو بلایا، اپنی پریشانی سنائی اور کہا "کیسی ترکیب سے معروف کا حال دریافت کرو۔ وہ کون ہے؟"



اس کا قافلہ کیوں نہیں پہنچا؟ کب تک آئے گا؟ اس میں کیا کیا سامان ہے؟

جواب ٹھیک ٹھیک دو گئے؟
"ایک ایک حوت صبح ہو گا۔ میرا سر چاہے کوئی اُتار
لے، غلط بات نہ کہوں گا۔"

شہزادی نے بتا کر ایک طرف رکھا اور کہا:
"نہ نہ۔ تم میرے متراج ہو۔ میں تمہاری لونڈی
ہوں۔ اب ہم تم مر کر ہی جدا ہوں گے۔ اچھا، یہ
تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کیا ہو؟ کہاں کے ہو؟ اور
وہ تمہارا قافلہ کہاں ہے؟"

یہ کہہ کر شہزادی مسکرائی۔ معروف نے بیسنے پر
دو ہتھ مارا اور کہا: "مے شہزادی۔ تو کرے گی میری
بربادی۔ خیر، میں نے وعدہ کیا ہے۔ جھوٹ نہیں
بولوں گا۔ سن میرا حال۔"

اب معروف نے اپنا قفہ سنایا۔ شروع سے سہتر تک
بالکل سچ سچ۔ ایک حوت تک نہیں چھپایا۔ آخر میں
"لولا" رہا قافلہ، تو وہ ابھی چلا ہی نہیں۔ یہ سب
منکاری ہے۔"

شہزادی خوب ہنسی اور لولی "واہ میرے متراج تم نے

ہم سب کو خوب بے وقوف بنایا۔ کمال کہ دکھایا۔
معروف نے کہا "ہاں، مگر بکے کی ماں کب تک خیر
منائے گی۔ ایک دن بھانڈا پھوٹے گا اور تمہارا باپ میری
گرفتاری مرڈے گا۔ جس طرح وزیر اپنی مونیچیں مروڑتا
ہے۔ اب بتاؤ۔ کس طرح میری جان بچے؟"

شہزادی عقل مند تھی۔ وہ نہیں پتاہتی تھی کہ اُس کا
بسا بسایا گھرا اُجڑ جائے۔ اُس نے کچھ دیر سوچا۔ پھر
"لولی" سنو۔ تم کو میں دس اشرفیاں دیتی ہوں۔ پانچ اشرفیاں
کسی پرے والے کو دو اور کہہ کہ بادشاہ کے اصطبل سے
ایک اچھا سا گھوڑا لے کر آئے۔ بس تم اندھیری رات میں
اس پر بیٹھو اور بھاگ جاؤ۔ فوراً، بہت دور۔ سرحد کے
پار۔ وہاں ٹھہر جانا۔ میں کچھ ترکیب بعد میں کہوں گی
اور تم کو بلاسنے کا انتظام کریں گی۔"

دلوں رات معروف گھوڑے پر بیٹھ کر رفو چکر ہو گیا۔
دوسرے دن، دوپہر کو شہزادی نے بادشاہ کے پاس ایک
خواہش بھیجی اور ملنے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے خادمہ سے
کہا "ضرور، ضرور آئے۔ مگر پہلے میں اپنے وزیر کو بلا لوں۔"

جو کچھ میرا مال بچا ہے ، وہ جمع کروں گا ۔ آس پاس سے اونٹ ، خچر ، گدھے منگادیں گا اور یہاں جلد سے جلد واپس آؤں گا ۔

” پھر حضور ، شہزادے نے فوجی لباس پہنا ، تلوار کمر سے باندھی ، پیٹھ پر ڈھال رکھی ، خنجر پیٹی میں لگایا اور چلا گیا ۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ، دروازے پر شہزادے کے کئی خادم ، گھوڑوں پر بیٹھے ، شہزادے کا انتظار کر رہے تھے ۔ اے حضور ، ان کا لباس اتنا قیمتی تھا کہ ہمارے وزیر کو بھی نصیب نہیں ۔ وہ ایک گھوڑا اپنے ساتھ لائے تھے ۔ اس پر شہزادہ بیٹھا اور گھوڑا ایسا دوڑا گویا ہوا ہے ، آندھی ہے ۔ شہزادے کے خادم بھی پیچھے دوڑے ۔

” ابا حضور ، خدا کا شکر ہے کہ میں نے شہزادے سے ابھی اُس کا حال نہیں پوچھا تھا ۔ اگر پوچھتی تو اُس کے دل میں میری قدر کم ہو جاتی ۔ اب میں دعا کرتی ہوں کہ وہ جلد اپنا قافلہ لے کر آئے ۔“

” آمین ، آمین “ بادشاہ نے دل میں کہا اور پھر شہزادی سے بولا ” بیٹی یاسمین ، ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟“

بادشاہ ، وزیر اور شہزادی ایک جگہ بیٹھے ۔ سب نوکر چاکر چلے گئے ۔ بادشاہ نے شہزادی سے کہا ” کیا خبر لائیں ، میری لاڈلی ؟“

شہزادی نے گہرا سانس لیا ، دوپٹا سنبھالا اور بولی ” خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے ۔ اے حضور ، رات کی خبر سنئے ۔ آدھی رات کو ایک خادمہ نے مجھے جگایا ، بتایا کہ باہر کوئی آیا ہے ۔ شہزادہ معروف سے ملنا چاہتا ہے ۔ بہت ضروری بات کہنی ہے ۔ میں نے شہزادے کو جگایا ۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر گیا ۔ میں اللہ سے دعا کرتی رہی کہ خبر کی خبر ہو ۔ شاید قافلہ محل کے باہر آ گیا ہو ۔“

” تھوڑی دیر بعد شہزادہ ایک خط لے کر آیا اور بولا کہ اس کا ایک جاں نثار خادم یہ خط لایا ہے ۔ میرا قافلہ صحرا میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی ۔ بہت سے قافلے والے مر گئے ۔ کئی سو اونٹ ، ڈاکو لے گئے ۔ دو چار سپاہی جو قافلے کے ساتھ تھے ، صحرا میں تڑپ رہے ہیں ۔ یہ حال سنا کر شہزادے نے کہا کہ شہزادی ، مجھے اجازت دو ۔ کچھ دن تک نہیں آسکوں گا

”گاؤں سے میرے لیے روٹی اور گھوڑے کے لیے دانہ لے آؤ۔“

کسان بولا ”میرا گاؤں دور ہے۔ خیر جاتا ہوں۔ دیر لگے گی۔ خفا نہ ہونا۔“

بڑی دیر تک کسان نہ پٹا، اس کے دونوں بیل سر جھکائے کھڑے رہے۔ معروف نے سوچا کہ بوڑھا میرے کام گیا ہے۔ لاؤ میں اس کا کام کروں۔ بیل چلاؤں۔ وہ بیل چلانے لگا۔ اُسے بیل چلاتے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دونوں بیل ایک دم ٹپک گئے۔ بیل کو بھی جھٹکا لگا۔ معروف نے بیلوں کی دُم زور سے مروڑی۔ ٹپک ٹپک بھی کی مگر بیل نہ ہل سکے۔ وہ زور لگاتے پر بڑھ نہ سکتے۔

”اوہو، بیل کا لوہا کتنی پتھر میں اٹکا ہے۔“ معروف نے دل میں سوچا۔ ہاتھ سے بیل اٹھا کر وہاں کی مٹی ہٹائی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک گنڈے میں بیل کا لوہا پھنسا ہوا ہے۔ معروف نے بیلوں کو کھولا۔ پھر مٹی ہاتھوں سے گریزی۔ گنڈا چمکنے لگا۔ دُرا مٹی اور ہٹائی تو دیکھا کہ ایک سفید پتھر چمکنے میں گنڈا گڑا ہوا ہے۔ یہ سفید پتھر ایک گدے لمبا، آدھ گز

”ابا حضور، شہزادہ کس گیا ہے کہ ایک دو دن پہلے میں اپنے آنے کی خبر بھیج دوں گا۔“

بادشاہ نے اس کہانی کا ایک ایک لفظ پس جانا۔ وزیر گردن جھکاتے واپس ہوا۔ وہ اتنا اداس تھا کہ اس کی سیدی طرف کی مٹھی بھی جھک گئی تھی۔

اب سُنو معروف کا حال۔ وہ رات بھر گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ اُس نے نہ دریا کی پروا کی نہ جھاڑ جھنکار کی۔ گھوڑا دوڑاتا چلا گیا۔ مگر صبح ہوتے بھی سرحد نہ آئی۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ اچانک ایک درخت کے نیچے ایک کنواں دکھائی دیا۔ وہاں رہٹ چل رہا تھا۔ معروف نے گھوڑے کو بھی پانی پلایا، خور بھی پیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا کسان بیل



چلا رہا تھا۔ معروف نے بوڑھے کو دو اشرفیاں دیں اور کہا

لکھا ہوا تھا۔ حُروف پڑھنے کے لیے معرُوف نے نگ کو آہستہ سے رُڑا۔ رگڑنے ہی آواز آئی ”میرے آقا، حاضر ہوں۔ کیا حکم ہے؟“

معرُوف نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں رُڈنی کافی تھی۔ دیوار کے پتھر تک دکھائی دے رہے تھے۔ مگر بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہی آواز آئی۔ ”میرے آقا، حاضر ہوں۔ کیا حکم ہے؟ یہ خادم ہر کام کر سکتا ہے۔“

معرُوف نے پھر سب طرف دیکھا۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو کہا ”کون بول رہا ہے؟ خادم ہوں، خادم ہوں کی رٹ لگا رکھی ہے۔ سامنے نہیں آتا۔“

”میرے آقا، لیجیے۔ مجھے دیکھیے۔“

معرُوف نے اُسے دیکھتے ہی کہا ”ہت تیرے کی۔ تو تو مجھے جن معلوم ہوتا ہے۔“

”میرے آقا، میں ایک ہزار جنوں کا سردار ہوں۔ میرا ہر جن ایک ہزار دیوؤں کا سردار ہے۔ ہر دیو کے قابو میں ایک ہزار شیطان ہیں۔ ہر شیطان ایک ہزار

چوڑا تھا۔ اب معرُوف نے مٹی صاف کر کے غور سے دیکھا، زور لگا کر گنڈا اٹھایا اور دو تین دفعہ زور لگانے سے پتھر اٹھا لیا۔ پتھر کے نیچے ایک زینہ تھا۔ معرُوف نے نیچے قدم رکھا۔ اُترا چلا گیا۔ بارہ سیڑھیوں کے بعد ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں بے شمار قیمتی پتھر، ہیرے، لعل، جواہرات پڑے تھے۔

اس کمرے کے ساتھ اور بھی کمرے تھے۔ معرُوف پنچوں کے بل چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گھُسا۔ یہاں لوہے کے صندوق پڑے تھے۔ نہ کسی میں قُفل تھا نہ تالا۔ ایک صندوق کھولا تو وہ زیروں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرا صندوق کھولا تو اس میں ریشم اور مخمل کے تھان بھرے ہوئے تھے۔ معرُوف نے سر گھمایا، یہ سوچنے کو کہ اتنا ڈھیریں زیور، لعل، جواہرات کس طرح باہر لے جاؤں گا۔ سوچ میں تھا کہ سامنے دیوار پر نظر پڑی۔ وہاں ایک الماری تھی اور الماری میں ایک چھوٹا سا ڈبا رکھا تھا۔ اُس نے ڈبا کھولا۔ اس میں ایک انگوٹھی ملی۔ سونے کی۔ اس میں ایک نگ جڑا ہوا تھا۔ نگ پر باریک باریک حُروف میں کچھ

کوئی مشکل کام ہو تو فرمائیے۔“
معروف نے کہا۔ ”اے ایک ہزار جنوں کے سردار ،
مجھے ایک ہزار اُونٹوں کی ضرورت ہے۔ یہ سارا خزانہ
چستان لے جانا ہے۔“

”میرے آقا ، یہ کام بھی آسان ہے۔ کچھ اور محکم؟“
”ٹھہرو بھئی ٹھہرو۔ پہلے میں اُوپر جا کر دیکھ تو لوں،
کہ یہ لڑکے سارا خزانہ کہاں لے گئے ہیں؟“

تمام صندوق ادھر ادھر پڑے تھے۔ معروف نے
خوشی سے بیٹی بھائی۔ اتنے میں اُونٹوں کی قطار کی قطار
چلی آئی۔ انھی لڑکوں نے سب صندوق اُونٹوں پر لادے۔
کچھ اُونٹوں کی پیٹھ پر بورے لٹک رہے تھے۔
میرے ، لعل اور جواہرات ان بوروں میں بھر دیے گئے۔
اب معروف نے کہا۔ ”اے ایک ہزار اُونٹوں کے
سردار ، نہ نہ .. جنوں کے سردار ، دیکھو ، کچھ اُونٹ
خالی کھڑے ہیں۔ کیوں نہ ان کے لیے بوجھ اکٹھا کیا
جائے۔“

ضرور میرے آقا۔ میرے خیال میں ملک شام کے

بد رُوحوں کا حاکم ہے۔“
”یہ کیا ایک ہزار کا پہاڑا سُنانے لگا۔ یہ بتا ، تو
یہاں کیوں آیا؟“
”میرے آقا ، جو شخص اس انگوٹھی سے بنگ کو رگڑتا
ہے ، میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ بنگ پر جو جادو لکھا ہے
میں اس کا غلام ہوں۔“
معروف نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ بہت خوش
ہوا۔ جن سے کہنے لگا ”دیکھو ، ان کمروں کا سارا خزانہ
سمیٹ کر باہر میدان میں پہنچا دو۔“

جن نے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ہوا میں اٹھائیں۔
کچھ اشارے کیے۔ زمین ہلی۔ پھر سامنے کی دیوار گری
اور لڑکوں کی ایک فوج کی فوج اندر داخل ہوئی۔ جن
نے اشارہ کیا تو لڑکوں نے صندوق اٹھائے اور منٹوں
میں باہر لے گئے۔

معروف نے پوچھا ”یہ پلٹن کس کی ہے؟“
”میرے آقا ، یہ میرے ہی بچے ہیں۔ اس معمولی سے کام
کے لیے میں نے کسی جن کو بلانا ضروری نہ سمجھا۔ ہاں

کئی تھی۔ اب صلح ہو گئی ہے۔ آؤ، کھانا بناؤں۔
جن کے باورچی نے طرح طرح کے مزے دار کھانے



پکاتے تھے۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر معروف
نے دیے کا پیالہ خالی کیا، اس میں ہیرے جھر دیے
اور کسان سے کہا ”لو اب تم مرتے دم تک آرام
کرو۔ ہل چلانے کی ضرورت نہیں۔“ بوڑھا کسان دُمائیں
دیتا ہوا چلا گیا۔

تیسرے دن ریشمی کپڑے، مخمل اور ململ کے تھان
بھی آ گئے۔ اتنے تھے کہ گنے نہ جاتے تھے۔ اب
معروف نے چلنے کی تیاری کی۔ اُس نے قافلے کا سردار

کے پھول دار ریشمی کپڑے، ایران کی مخمل اور ڈھاکے کی
ململ ان پر لادی جائے۔ مگر ڈھاکا بہت دُور ہے۔
مال لانے میں تین دن لگیں گے۔“

معروف بولا ”کوئی ہرج نہیں۔ ہم یہیں انتظار کریں
گے۔ ہمارے رہنے کے لیے خیمہ لگا دو اور سو پچاس
مضبوط جوان بلاؤ کہ اس خزانے کی حفاظت کریں۔“
ابھی لیجے میرے آقا۔ میرے خیال میں کھانا پکانے
کے لیے باورچی بھی آنا چاہیے۔“

معروف نے کہا ”ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ باورچی تو بہت
ضروری ہے۔ اُسے بھی فوراً حاضر کرو۔“

اب اُس بوڑھے کسان کی سُنو۔ وہ ہانپتا کانپتا تیسرے
پہر کو واپس آیا۔ ایک ہاتھ میں دیے کا پیالہ تھا اور
دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کے لیے دانے کی پوٹلی۔ اُس
نے اپنے کھیت میں ایک شان دار خیمہ لگا دیکھا
تو دنگ رہ گیا۔ خیمے پر سپاہی پہرا دے رہے
تھے معروف نے کسان کو خیمے میں بلا لیا اور کہا
”میں چیتان کے بادشاہ کا داماد ہوں۔ ہماری اُن بِن ہو

ہیں کہ تم دس پانچ جوانوں کے ساتھ جا کر چیتان کے
بادشاہ کو اطلاع دو کہ شہزادہ معروف کا قافلہ آ رہا
ہے۔

اُسی دن رات کو چیتان کے بادشاہ کو پہرے داروں
نے بتایا کہ شہزادہ معروف کے چند خادم آئے ہیں۔
بادشاہ اپنے پلنگ سے اتنی پھرتی سے اٹھا جیسے کسی
جن نے اٹھا دیا ہو۔ اُس نے فوراً وزیر کو بلایا اور
تکم دیا کہ سارے شہر کو دھن کی طرح سجاؤ، باجے
بجواؤ، رات کو گھر گھر چراغاں ہو۔

شہر کے سوداگر شہزادہ معروف کا آنا سن کر سجدے
میں گر پڑے۔ فقیر، غریب خوشی سے ناچنے لگے۔

بادشاہ نے فوراً ہی لباس پہنا اور فوج لے کر
شہزادے کو لینے کے لیے روانہ ہوا۔ فوج کے پیچھے
ہزاروں لوگ ناچتے گاتے چلے جا رہے تھے۔

معروف نے بادشاہ کو دیکھا تو جھٹ پالکی سے
گودا۔ بادشاہ نے گلے لگا لیا۔ معروف نے اُس کو بھی
پالکی میں بٹھا لیا اور یہ جلوں واپس شہر کی طرف

اپنے خادم جن کو بنا دیا تھا — جن ایک خوب صورت
جوان انسان کی شکل میں تھا۔ اس کے درجنوں لڑکے



بھی انسان کے روپ میں تھے۔ جن نے معروف کے لیے
بادشاہی لباس اور ایک بڑی سی پالکی بھی منگا لی تھی،
جس کو بارہ لڑکے کندھوں پر رکھ کر چلتے تھے۔ اس پالکی
پر موتیوں کا پردہ پڑا تھا۔

اب چلا یہ شان دار قافلہ۔ معروف کی پالکی کے قریب
قافلے کا سردار جن ایک بھاری بھرکم گھوڑے پر سوار تھا۔
اس کے پیچھے ایک سو ایک جوان، گھوڑوں کی باگیں
کھینچتے، آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ جب یہ قافلہ چیتان
کے پاس پہنچا تو معروف نے جن سے کہا: ”ہم چاہتے

بادشاہ ہو گا۔

کچھ دن بعد معروف نے مصر سے اپنی ماں کو بھی
بلوا لیا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔



چلا۔ محل میں جا کر معروف نے سب سے پہلے سوداگر



کو بلایا۔ ایک ہزار اشرفی کے بدلے دس ہزار اشرفیاں
دیں۔ اسی طرح سب سوداگروں کا قرضہ ادا کیا۔ ایک
کے بدلے دو دیے۔ پھر شہزادی یاسمین کو بلایا۔
اُسے قیمتی سے قیمتی کپڑا، زیور اور بہت کچھ تحفے دیے۔
ہیرے، جواہرات بادشاہ کے خزانے میں رکھوا دیے۔
بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ میرے بعد معروف

دوست بولے ”پروا نہیں۔ تم شروع کر دو۔“
سندباد نے گلا صاف کیا، پانی پیا اور بولا ”اچھا تو
لو سُنو۔“

”میرے باپ کو دولت جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ



خوب محنت سے کماتے مگر دھيلا خرچ نہ کرتے۔ دولت جمع
ہونے لگی۔ جب ڈھیر ساری چاندی، سونا اکٹھا کر لیا تو

سندباد جہازی

بہت دنوں کی بات ہے، بغداد میں ایک مال دار
سوداگر رہتا تھا۔ نام تھا سند باد۔ سارے شہر میں
اُس کی دھوم تھی۔ بادشاہ تک اُس کی عزت کرتا تھا۔
ایک دن اُس کے مکان پر محفل جمی تھی۔ یار دوستوں
کا مجمع تھا۔ ایک دوست بولا ”یار سند باد، تم نے کئی
دفعہ وعدہ کیا کہ اپنے سفر کے حالات سناؤ گے۔ لو، آج
وعدہ پورا کرو۔ ہم سُن کر ہی جائیں گے۔“
سند باد نے کہا ”یارو، بہت لمبا قصہ ہے۔ کئی دن
میں ختم ہو گا۔“

کچھ دن بعد ایک جزیرہ آیا، پھر دوسرا آیا۔ مگر جہاز کے کپتان نے کہیں ٹھہرنا پسند نہ کیا۔

"کئی دن تک پانی ہی پانی اور آسمان ہی آسمان دیکھتے دیکھتے ہمارا جی بھر گیا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک بہت ہی خوب صورت جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی گھاس دیکھ کر ہمارا جی چاہا کہ کچھ دیر کے لیے یہاں اتر جائیں۔ کپتان کو بھی یہ جزیرہ بھلا لگا۔ جہاز کا رخ اس طرف کر دیا۔ خشکی کے قریب جہاز رکا۔ لکڑی کے بڑے بڑے تختے جہاز سے خشکی تک پہنچائے گئے۔ مسافر اور جہاز کے ملاح اتر گئے۔ ملاح اپنے کپڑے دھونے لگے۔ بعض نے آگ جلائی۔ کھانا پکے لگا پھیلیاں تلی جا رہی تھیں۔ خوش بو پھیل رہی تھی۔ لطف آ رہا تھا۔ ہنسی مذاق چل رہے تھے۔

"میں دو تین سوداگروں کے ساتھ جزیرے کی سیر کرنے چلا۔ ہم ابھی بہت دور نہ گئے تھے کہ جہاز سے بیچ پکار کی آوازیں آئیں۔ ایسی آوازیں جیسے کوئی مصیبت آ گئی ہو۔ شور بڑھتا ہی گیا۔ ہم نے جہاز

چل بسے۔ میں چھوٹا تھا۔ دوسرا کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ بس میری اماں تھیں۔ بڑی نیک۔ بھولی بی بی۔

"دوستو، جب مفت کی دولت ملتی ہے تو اسے خرچ نہیں کیا جاتا، لٹایا جاتا ہے۔ میں نے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ سارے بغداد کے آوارہ لڑکے میرے دوست بن گئے تھے۔

"میری ماں محبت کے مارے کچھ نہ کہتی۔ دو سال بعد میں نے دیکھا کہ نہ چاندی رہی نہ سونا۔ اب تو میں گھبرایا۔ اماں کو حال بتایا۔ انھوں نے کہا "نہ گھبرا۔ باغ، مکان بیچ کر سوداگری شروع کر۔"

"میں نے یہی کیا۔ دو تین باغ بیچے، دو مکانوں میں سے ایک مکان بیچا۔ پھر کپڑوں کے تھکان، قالین اور بغداد کی مشہور مشہور چیزیں خرید کر اکٹھی کیں۔ میں نے سوچا یہ سب سامان کسی دوسرے ملک میں لے جا کر بیچوں، نفع بھی کماؤں اور دنیا کی سیر بھی کروں۔

"دوسرے کئی سوداگروں کے ساتھ میں نے بھی جہاز پر مال لدوایا اور جہاز سمندر میں ہچکولے کھاتا روانہ ہو گیا۔

سمندر میں بھٹور سا پڑ گیا۔ جہاز پانی کے اُچھلنے سے اتنے زور سے ہلا کہ سب مسافر چیخ پڑے۔ اب میں



سمندر میں پڑا ڈکیاں کھا رہا تھا۔ اتنے میں کسی چیز سے میرا سر ٹکرایا۔ دیکھا تو وہ لکڑی کا ایک بہت بڑا ٹوکڑا تھا۔ جہاز والے اس میں کپڑے دھویا کرتے تھے۔ میں نے اُسے اوندھا کیا اور اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ”جہاز دور نکل گیا تھا۔ اب کسی کو آواز دینا، مدد کو بلانا فضول تھا۔ میرے چاروں طرف لمبا چوڑا ہیبت ناک سمندر تھا۔ اُس کی تڑا تڑ پڑنے والی لہریں لکڑی کے ٹوکڑے کو اُچھال اُچھال دیتی تھیں۔

کی طرف دیکھا۔ کوئی کھڑا سفید کپڑا ہلا رہا تھا۔ کوئی ہاتھ نہ پا رہا تھا۔

”پہلے تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ایک دم دوڑے جہاز کی طرف۔ شتم شتم کر کے جہاز تک پہنچے تو سارے مسافر جہاز پر چڑھ چکے تھے۔ لکڑی کے تختے ہٹا لیے گئے تھے اور جہاز لنگر اُٹھا کر چلنے لگا تھا۔ ”میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیا ہوا، کیوں اتنی گھبراہٹ میں سب ملاح اور مسافر جہاز پر جا چڑھے اور کیوں جہاز ہم کو چھوڑ کر روانہ ہو گیا کہ اتنے میں زمین بلی۔ ایسی کہ میں کھڑے کھڑے گر گیا۔ میرے ساتھی چیخنے لگے۔ اب میں سمجھا، یہ شور و غل کیوں تھا۔ ہم جس کو زمین سمجھے تھے یہ ایک بہت بڑی پھلی تھی۔ برسوں سے پڑی سو رہی تھی۔ اس پر مٹی خاک جم گئی تھی اور گھاس اُگ آئی تھی۔ اب جو ہم لوگوں نے اس کے اوپر اُگ جلائی تو پھلی جاگ گئی۔

”بس دوستو، پھلی نے کروٹ لی اور غراپ سے پانی کے نیچے چلی گئی۔ وہ اتنی بڑی تھی کہ اس کے اترنے

دن ریگتا رہا۔ ریگتا، تھکتا، پڑ رہتا، اُدنگھ لیتا، پھر
ریگنے لگتا۔ شام کے قریب ایسی جگہ پہنچا جہاں کھجوروں
کے درخت تھے۔ اُن کے بیچے، کچھ کچی کچھ پکی کھجوریں
پڑی تھیں۔ اتنے شوق سے میں نے کچی، پکی کھجوریں کھائیں
کہ مزہ آ گیا۔ پھر میں سو گیا۔

”صبح ہوئی، سورج چمکا۔ میں نے بھی سفر شروع کیا۔
اُسی طرح پیٹ کے بل۔ یا کبھی نختے پتوں کی طرح گھٹیاں
چل چل کر۔ قصہ لمبا کرنے سے کیا فائدہ، مجھے کچھ
درخت پھل دار مل گئے۔ پھل کھا کر گزارہ کیا۔ کئی دن اسی
طرح، اس سُنان جگہ گزر گئے۔ کوئی جان دار شے نظر نہ
آئی۔ یا الٹی، یہ کیا قصہ ہے؟ کوئی چڑیا، پرندہ، کچھ
بھی نہیں؟

”اب مجھ میں طاقت آ گئی تھی۔ چل سکتا تھا۔ ایک
دن دُور ایک دھبّا سا نظر پڑا۔ آگے بڑھا تو یہ دھبّا
بڑا ہو گیا۔ یہ ایک گھوڑی تھی۔ گھاس چر رہی تھی۔ دیر
ہم اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ گردن جھکائے اپنے کام
میں لگی رہی۔ مگر جب گردن اٹھائی، مجھے دیکھا تو اتنے

”اب رات ہوئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ مجھے زندہ رہنے
کی اُمید نہ رہی، سوچا، کوئی بڑی مچھلی مجھے دیکھ لے گی
اور نوالہ بنا لے گی۔ مگر مثل مشور ہے، جسے خدا رکھے
اُسے کون چکھے۔ میں نہ مچھلی کا نوالہ بنا نہ کسی مگرچھ کے
پیٹ میں اُترا۔ صبح ہوئی۔ سمندری لہروں نے میرے کوندے
کو ایک دوسرے کے قریب پہنچا دیا تھا۔ تسلی ہوئی کہ
خُشکی پر اُتروں گا۔ مگر آہ۔ ایک دم تیز ہوائیں چلنے لگیں۔
پانی کی لہریں دس دس گز اُونچی اُٹھنے لگیں۔ اب خیر نہیں۔
میں نے سوچا، یہ کونڈا ڈوبے اور ڈوبے۔ اور تو،
اے سندباد، مچھلی کا نوالہ بنے اور بنے۔

لہروں نے کوندے کو خُشکی کے قریب پہنچا دیا۔ یہاں
درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض جھک کر سمندر
کو سلام کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک درخت کی
بُٹنی میں نے پکڑ لی اور گھسٹتا گھسٹتا کنارے تک پہنچا۔
بڑا مُصِیبت کا وقت تھا مگر مڑنا کیا نہ کرتا۔ میں نے
جھپکی کی طرح زمین پر ریگنا شروع کیا کہ کچھ کھانے
کی چیز دیکھوں۔ تم سُن کر تعجب کرو گے کہ میں سارا

”میں نے اس بھلے آدمی کا شکریہ ادا کیا۔ رات اسی کھوہ میں سویا۔ صبح اُٹھا تو دیکھا کہ بادشاہ کے کئی خادم آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تمام گھوڑے گھوڑیاں جمع کیں۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ مجھے بھی ایک گھوڑی دی۔ اب ہم سب بادشاہ کے دربار کی طرف چلے۔“

جب بادشاہ کو بتایا گیا کہ میں ایک مُصِیبت کا مارا مسافر ہوں تو اس نے مجھے بلوایا۔ میرا حال سُنا۔ اللہ کی تعریف بیان کی، جس نے مجھے آفت سے بچایا۔ پھر مجھے اپنے جہازوں کی دیکھ بھال پر نوکر رکھ لیا۔



”اُس ملک کی بندرگاہ بہت بڑی تھی۔ روزانہ کئی جہاز آتے، کئی روانہ ہوتے۔ اُن سے جو سامان سوداگری کا اُترتا، میں اس کو دیکھتا۔ محصول وصول کرتا۔ میرے ذمے یہ کام بھی تھا کہ جو جہاز یہاں لنگر ڈالے، میں اُس کے مسافروں اور ملاحقین

زور سے پہنچائی کہ میں ڈر کے مارے اُچھل پڑا۔ وہاں سے بھاگا ہی تھا کہ ایک آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے پاس پہنچا تو اُس نے پوچھا:

”تم کون ہو؟“

”جی، میں مُصِیبت کا مارا مسافر ہوں۔ جہاز مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“

”وہ بھلا آدمی تھا۔ میرا ہاتھ پکڑا، قریب ہی ایک کھوہ تھی۔ وہاں لے گیا۔ یہ اُس کا مکان تھا۔ کھانا کھلایا، پانی پلایا۔ پھر میرا حال پوچھا۔ میں نے اب تک جو گزری تھی، کہہ سُنائی۔ وہ گردن ہلا کر رہ گیا۔ پھر میں نے سوال کیا ”اے اللہ کے بندے، تو کون ہے اور اس سُنان جگہ، اس اندھیری کھوہ میں پڑا کیا کرتا ہے؟“

”وہ آدمی مُسکرا کر بولا ”میں اپنے بادشاہ کا نوکر ہوں۔ اس کے گھوڑوں کو چراتا ہوں۔ کل میں شہر واپس جاؤں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ بادشاہ کے پاس تم کو لے جاؤں گا۔“

مالک کے گھر والوں کو دے دوں گا۔
"میں نے پوچھا "اس کا مالک کہاں ڈوبا تھا؟"
"کپتان نے کہا "سمندر میں ڈوبا تھا اور کہاں ڈوبتا؟"
"ڈوبنے والا کہاں رہتا تھا؟"

"بغداد کا رہنے والا تھا۔"

"اس کا نام تو بتائیے۔"

"جناب، اُس کا نام بسند باد تھا۔"

"اب میں نے کپتان کو غور سے دیکھا تو پہچان گیا۔
خوش ہو کر کہا:

"آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں ہی تو بسند باد ہوں۔
اللہ کے فضل و کرم اور بادشاہِ مہربان کی مہربانی سے
میں اس بندگاہ کا منشی بن گیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے
کہ آپ میرا تجارتی سامان لے کر یہاں پہنچے۔"

"اتنے میں دو چار ملاح اور کئی مسافر وہاں جمع ہو
گئے۔ اُنھوں نے مجھے پہچان کر گلے لگایا اور خدا
کا شکر ادا کیا کہ زندہ سلامت ہوں۔"

"کپتان نے میرا تمام اسباب اُتروایا۔ سامان پر میری

کا نام پتا لکھ لیا کروں۔ میں ان مسافروں اور ملاحوں
سے بغداد کا حال پوچھتا۔ وہ کہتی دود ہے؛ کدھر ہے؟
مگر افسوس۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

"بادشاہ کا نام مرجان تھا۔ وہ مجھ پر مہربان تھا۔
وہ میرے کلام سے خوش تھا اور بندرگاہ پر آنے
والے مسافر اور ملاح بھی خوش رہے۔"

"ایک دن، وطن کی یاد میں، غم زدہ صورت بنائے
بیٹھا تھا کہ دُور سمندر میں ایک جہاز نظر آیا۔ وہ ادھر
ہی آ رہا تھا۔ جب وہ بندرگاہ پر پہنچا تو اس میں سے
بہت سے سوداگر اُترے۔ جب سارا مال اسباب اُتار
دیا گیا تو میں نے کپتان سے پوچھا "اور سامان تو
جہاز میں نہیں ہے؟ مجھے اپنے ریستر میں اس جہاز
کا سارا مال لکھنا ہے۔"

"کپتان نے جواب دیا "جناب، سب سامان نہیں اُتارا
ہے۔ کچھ سامان باقی ہے۔ اُس کا مالک سمندر میں ڈوب
گیا تھا۔ آپ چاہیں تو وہ سامان دیکھ لیں۔ وہ سامان
مجھے یہیں بیچنا ہے۔ جو قیمت ملے گی، سامان کے

مُٹ لگی ہوئی تھی — کپتان اتنا ایمان دار تھا کہ میرا کوئی سامان نہ لیا۔ لوٹا اور پانی کی چھاگل تک دے دی۔ میں نے سامان کھولا۔ کپڑے کے کئی قیمتی تھان اپنے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ سارا قصہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اللہ کی تعریف بیان کی اور مجھے بہت سے قیمتی تحفے دیے۔



”میں نے بھی سوداگری کا مال دوسرے سوداگروں کی طرح کمایا۔ پھر وہاں سے اناج، ناریل اور بہت سی چیزیں خریدیں۔ جہاز میں لدوائیں اور پھر بادشاہ سے اجازت لے کر اپنے وطن واپس ہوا۔ بغداد میں میرا سامان ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور خدا نے مجھے مال دار بنا دیا۔

”اچھا دوستو، اب جاؤ۔ خدا نے چاہا تو کل دوپہر کو پھر ملیں گے۔ کل تمہیں ایسے قصے سناؤں گا کہ حیران رہ جاؤ گے۔“

ہیروں کا جزیرہ

دوسرے دن، شام ہوتے ہی سند باد کے دوست آگئے اور لگے کہانی سنانے کا تقاضا کرتے۔ سند باد نے ان کے لیے قہوہ بنوایا۔ سب کو آرام سے بٹھایا اور پھر کہانی شروع کی:

”دوستو، میں نے سفر سے واپس آ کر سال بھر تک آرام کیا۔ کوئی کام نہیں کیا۔ جب بے کار پھرنے سے دل بھر گیا، جی اکتا گیا تو سوچا کہ پھر دنیا کی سیر کو نکلوں۔ نئے نئے علاقے دیکھوں، بھانت بھانت کی بولی بولنے والوں سے بلوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیوؤں۔

پانی کے چشے بھی۔ ملاحوں نے پانی بھر بھر کر جہاز میں جمع کر لیا۔ پھل بھی خوب توڑے اور کھائے۔ ہوا بہت صاف اور ٹھنڈی تھی۔ درختوں کے سائے بھی بھلے نظر آتے تھے۔ میں ایک درخت کے نیچے، نرم نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ سوتا رہا۔ سوتا رہا۔ اب جو جاگا تو ہک دک رہ گیا۔ نہ وہ جہاز تھا، نہ ملاح، نہ ساتھی سوداگر۔ وہ مجھے اس جنگل میں اکیلا چھوڑ کر چلتے بنے تھے۔

”میں بھاگ کر ساحل پر آیا۔ وہاں سولے چڑیوں کے کچھ نہ تھا۔ دُور، بہت دُور، جہاز جاتا نظر آیا۔ وہ کھلونے سے بھی چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ چیخا چلایا مگر بے فائدہ۔ جہاز چلتا رہا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ ہائے ری قسمت۔ غم سے بندھال ہو کر وہیں ریت پر بیٹھ گیا۔“

”میں اپنے کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ کیوں بغداد سے نکلا تھا۔ مگر وہ جو سیانے لوگ کہتے ہیں کہ:

اب بیچھٹائے ہوت کیا
جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

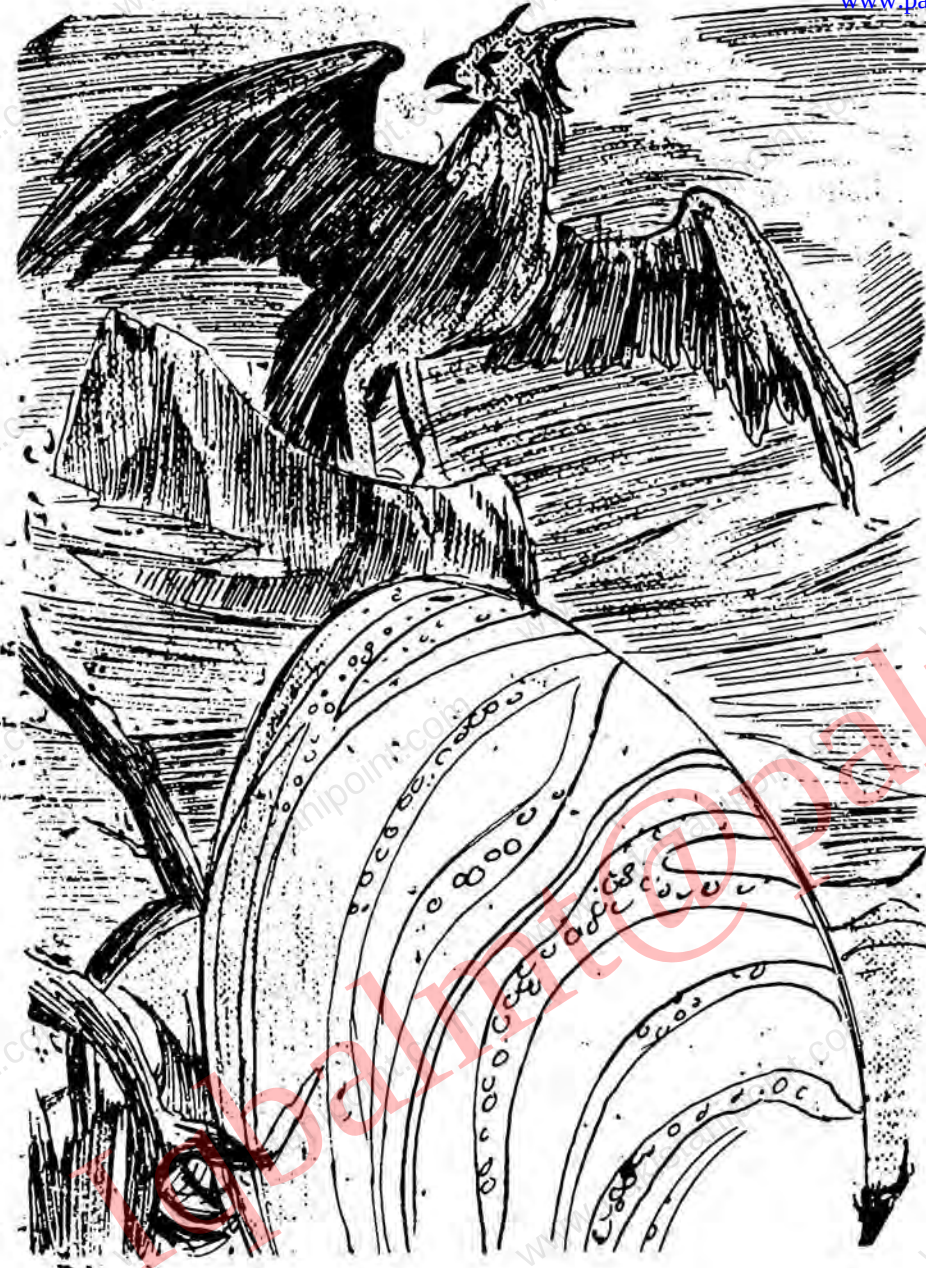
”بس، میں نے سوداگری کا سامان خریدا، جہاز میں لادا اور نکل کھڑا ہوا۔ یہ جہاز چھوٹا تو تھا مگر تھا مضبوط اور نیا۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے سوداگر جہاز میں سوار تھے۔ جہاز کا کپتان بہت شریف اور نیک آدمی تھا۔ وہ ہمارے آرام کا خیال رکھتا تھا۔“



”دس بارہ دن سمندر میں چلنے کے بعد ہمیں کئی جزیرے ملے۔ ہر جزیرے پر جہاز ٹھہرتا، ہم کچھ سامان بیچتے، کچھ نیا مال خریدتے۔ جزیرے کے لوگوں سے باتیں کرتے، اپنی سُناتے، اُن کی سُننے۔ اس طرح کچھ سیکھتے، کچھ سکھاتے۔ پھر آگے چل پڑتے۔“

”کوئی دو مہینے بعد ہم ایک بڑے سے جزیرے کے پاس پہنچے۔ یہاں درخت بہت بڑے اور گھنے تھے۔ سب نے کہا کہ جزیرے کی سیر کرنی چاہیے۔ کپتان بھی پانی سے اُگتا گیا تھا۔ ٹشکی کے قریب جا کر لنگر ڈالا، جہاز روکا اور ہم سب اُتر پڑے۔“

”یہ جگہ بہت اچھی تھی۔ پھل دار درخت بھی تھے اور



”بس دوستو، میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ دیکھنے کو کہ کہیں اس پاس کوئی انسان نظر آئے تو اس کے پاس جاؤں۔ مگر دور دور سوائے درختوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ دیکھنا رہا، دیکھتا رہا۔ گردن موڑ موڑ کر۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر آخر ایک چیز نظر آئی۔ سفید اور چکنی۔ وہ اتنی دور تھی کہ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ کیا ہے

”میں درخت سے اترا۔ لپکا لپکا اُسی طرف چلا۔ کافی دور جگہ تھی۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا وہ تو ایک گنبد ہے۔ سفید۔ چکنی چکنی۔ میں اس گنبد کے چاروں طرف پھرا۔ کوئی سیڑھی نہ تھی کہ اوپر چڑھتا۔ پھر وہ چکنی بھی بہت تھا۔ ہاتھ لگاؤ۔ تو پھسلے۔ پاؤں جننے کا تو ذکر ہی کیا۔ ”میں حیران ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کسی بزرگ کا مزار ہے جسے اس طرح ڈھانک دیا گیا ہے۔ اب شام ہونے لگی تھی۔ میں ڈوبتے سورج کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ جیسے کالی گھٹا آسمان پر پھیل گئی ہو۔ مگر یہ گھٹا تھی نہ بادل۔ یہ ایک بہت بڑا پرندہ تھا جس کے پر ایک میل تک پھیلے ہوئے تھے۔

نکل نہیں سکتا۔ اس پرندے کا پنچہ پکڑ کے لٹک جاؤں
شاید یہ مجھے کسی آبادی میں پہنچا دے۔
”لو دوستو، میں نے اپنی پگڑی سر سے اتاری۔ اُسے
دوہرا کر کے رسی بنائی۔ ایک سرا اپنی کمر میں باندھا
اور دوسرا سرا اپنی کمر میں باندھا۔ پرندے کو پتا تک
نہ چلا۔ اگر کوئی چیونٹی تھارے پیر پر بیٹھ جائے تو
تھیں کیا پتا چلے گا!

رات ہو گئی تھی۔ سونا کیسا۔ ڈر کے مارے جاگتا
ہی رہا۔ سورج نکلنے ہی پرندے نے پَر پھڑ پھڑائے
جس سے درخت جھوم جھوم گئے۔ پھر وہ ”ٹال“ کر کے
اوپر اٹھا۔ میں اُس کے پنچے میں لٹکا ہوا تھا۔ اُڑتے
اُڑتے وہ بہت دُور چلا گیا۔ آخر، خدا خدا کر کے اُس
نے پنچے کی طرف غوطہ مارا۔ پھر ٹپ ٹپ کی آواز
آئی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

”پرندہ ایک لقی دق میدان میں اُترا تھا۔ میں نے
پگڑی کی گرہ کھول دی اور چپ چاپ لیٹا رہا۔ پرندے
نے گردن اٹھا کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا، جیسے

اُت فو۔ اور اس کا بدن؟ کیا بناؤں، جیسے کوئی پہاڑی۔
دوستو، میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔ ذرا پانی پی لوں۔“
قوراً ہی ایک ملازم پانی کا گلاس لے آیا۔ سبباد
نے پانی پی کر الحمد للہ کہا اور پھر کہانی شروع کی۔
”ہاں تو، اُس خوف ناک پہاڑی جیسے پرندے کو
دیکھ کر مجھے ایک ملاح کا سنایا ہوا قصہ یاد آگیا۔
اُس نے کہا تھا کہ ایک جزیرے میں اتنے بڑے بڑے
پرندے ہیں کہ آدمی دیکھے تو ڈر کے مارے بے ہوش
ہو جائے۔ ان پرندوں کو ”اُڑن پہاڑی“ کہتے ہیں۔
بس، میں سمجھ گیا کہ یہ اُڑن پہاڑی ہے اور یہ گنبد
اس اُڑن پہاڑی کا انڈا ہے۔ یہ خیال ٹھیک نکلا۔
”لو صاحب، وہ پرندہ پر سمیٹ کر، اس گنبد پر
بیٹھ گیا۔ جیسے مرغی انڈوں پر بیٹھتی ہے۔ اُس نے
اپنی چونچ پروں میں چھپا لی تھی۔ میں نے سوچا کہ
یہ بہت دُور سے آیا ہو گا۔ اسی لیے تھک کر اتنی
جلدی سو گیا۔ اب میرے دل میں ایک انوکھا
خیال آیا۔ سوچا، ویسے تو میں اس ویران جزیرے سے

پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ ایک ایک پتھر ہزاروں روپوں کا، اور ایک ایک کنکر ہزاروں اشرفیوں کا ہو گا۔
”میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا مگر مشکل یہ تھی کہ ان بیروں کو اٹھاؤں کیسے؟ لے جاؤں کیوں کر؟ میرے پاس پگڑی تھی۔ میں نے ہیرے جمع کرنے شروع کیے۔ پگڑی میں باندھنے کے لیے۔ مگر ابھی دو چار مٹھیاں ہی بھری تھیں کہ کیا دیکھتا ہوں ایک اڑدیا چلا آ رہا ہے، بالکل ویسا ہی جیسا وہ پرندہ پنچے میں دبا کر لے گیا تھا۔ وہ اتنا موٹا تھا کہ ایک گدھا نکل سکتا تھا۔ مجھے نکل لینا تو اُس کے لیے معمولی بات تھی۔

”تھوڑی دیر بعد، دوسری طرف، ایک اور ویسا ہی اڑدیا بل کھانا دکھائی دیا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ اس میدان میں بہت سے کھڈ تھے اور ہر کھڈ میں ایک ایک اڑدیا تھا۔ میری حالت اُس وقت عجیب تھی۔ ایک طرف تو ہزاروں ہیرے تھے اور دوسری طرف اڑدیاں۔ سارا دن جھوکا پیاسا ان اڑدیاں سے بچتا پھرا۔
”جب شام قریب آئی تو پہاڑ کی طرف چلا۔ سوچا،

شکار تلاش کر رہا ہو۔ آخر اُسے ایک چیز نظر آ گئی معلوم



ہے وہ کیا چیز تھی؟ ایک اڑدیا۔ سانپ سے دس گنا موٹا۔ پرندے نے ایک دم لپک کر اڑدیا کو پنچے میں پکڑ لیا اور یہ جاؤ جا۔ کہیں کا کہیں پہنچا۔
”اب میں نے اس جگہ کو دیکھا۔ اڑدیا، اڑدیا، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہائے ری قسمت۔ یہ ایک سُنان جگہ تھی۔ میں ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ جہاں نہ گھاس تھی نہ درخت۔ سامنے ایک ایسا ہی ننکا پہاڑ تھا۔ اس پر چڑھنا آسان نہ تھا۔ سیدھا سیدھا کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس ٹیلے سے نیچے اُتروں اور کوئی سایہ دار درخت دیکھوں۔

”اب جو نیچے میدان میں آیا تو خدا یاد آ گیا۔ میدان میں دُور دُور تک پتھر کنکر بکھرے پڑے تھے۔ اور یہ پتھر کنکر کیا تھے؟ ہیرے تھے۔ ہیرے۔ چمک دار۔ ان

میں دبا کر اوپر پہاڑی پر آ جاتا ہے۔ وہ گوشت کھا جاتا ہے اور ہیرے وہیں پڑے رہتے ہیں۔ سوداگر گدھوں کو بھگا کر ہیرے چُن لیتے ہیں۔

”میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے سوچا، اسی طرح میں پہاڑی پر پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بھڑکا لوٹھرا اٹھایا۔ جتنے ہیرے جمع کر سکتا تھا، اپنے دامن میں بھر لیے۔ پھر لیٹ کر گوشت کا لوٹھرا اپنے پیٹ پر رکھا اور پگڑی سے اپنی کمر سے کس کر باندھ لیا۔ اس جزیرے کے گدھ بھی بہت بڑے بڑے تھے۔ ایک گدھ نے پہاڑ کے اوپر سے گوشت کا بڑا سا لوٹھرا دیکھا، جو میرے پیٹ سے بندھا ہوا تھا تو غیب سے غوطہ



مارا۔ اپنے لمبے لمبے پنچوں میں گوشت کو دلوچا اور لے اڑا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر گوشت کھانا ہی چاہتا

اُس کی کسی کھوہ میں پڑ کر سو جاؤں گا۔ یہاں تو اڈ رہے ہی اڈ رہے ہیں۔ لیکن بھوک کے مارے چلنا دُور بھر تھا۔ نھوڑی ہی دُور چلا ہوں گا کہ گر پڑا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ گھٹنا گھٹٹا ٹیلے تک پہنچا اور اُس کی آڑ میں لیٹ گیا۔

خوف کے مارے رات بھر جاگتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اٹھا اور پہاڑی کی طرف چلا۔ سورج کی کرنوں سے ہیرے ایسے چمک رہے تھے جیسے رات کے تارے۔ ذرا دیر ہی گزری تھی کہ ایک دھماکا ہوا۔ دھام۔ یہ ایک مُردہ بھڑکتی تھی، جس کی کھال اُتار لی گئی تھی۔ کسی نے پہاڑ پر سے نیچے پھینکی تھی۔

”اس دھماکے سے مجھے ایک قصہ یاد آ گیا جو ایک ملاح نے سنا یا تھا کہ سندھ کے سوداگر ہیروں کے میدان کی پہاڑی پر چڑھ جاتے ہیں اور پھر وہاں سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نیچے پھینک دیتے ہیں۔ ان ٹکڑوں میں ہیرے چپک جاتے ہیں۔ کوئی گدھ گوشت دیکھ کر نیچے غوطہ مارتا ہے اور گوشت پنچے

”سوداگر مجھے اپنے نیچے میں لے گیا اور خوب کھانا کھلایا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ آج تک کوئی انسان اژدھوں کے میدان سے زندہ نہیں آیا ہے۔ اژدھے اسے دیکھتے ہی ٹھپ کر لیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں سو گیا اور ایک دن اور ایک رات سوتا ہی رہا۔ سوداگر ہیرے جمع کرنے میں لگا رہا۔ وہ بکرا یا بھیڑ کا بچہ ذبح کر کے، اس کی کھال اُتار لیتا۔ پھر گوشت نیچے اژدھوں کے میدان میں پھینک دیتا۔ وہاں سے کوئی گدھ اسے اٹھا کر پہاڑی پر آ جاتا۔ گوشت میں بہت سے ہیرے چھپے ہوئے ہوتے، وہ سوداگر لے لیتا۔ جب سوداگر کے پاس کافی ہیرے جمع ہو گئے تو ہم سب وہاں سے روانہ ہوئے۔ دن بھر چلتے، رات کو خیمہ لگا کر سو جاتے۔ جو لوگ باجے تاشے بجاتے تھے، وہ ہمارے نیچے پر پرا دیتے۔

”اس طرح ایک مہینے تک پیدل چل کر ہم شہر میں آئے۔ وہاں سے میں جہاز پر بیٹھا اور بغداد آ گیا۔ نیک دل سوداگر نے میرے ہیرے مجھے دے دیے۔ اس طرح

تھا کہ زور زور سے باجے تاشے بجنے لگے۔ اس پاس سے بہت سے انسان لمبے لمبے بانس لیے، شور مچاتے، ڈھول بجاتے، آ پہنچے۔ گدھ اس شور سے ڈر کر اڑ گیا۔ اب میں نے کمر کھولی۔ اتنے میں کئی سوداگر وہاں آ گئے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”ایک سوداگر، جو صورت سے بہت دولت مند معلوم ہوتا تھا، بولا ”تم یہاں کیسے آئے؟“ میں نے سارا قصہ سنایا اور گدھ کو دعائیں دیں کہ وہ مجھے اژدھوں کے مُنڈ سے زندہ بچا لایا۔

”سوداگر نے اپنا سر پیٹ لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا ”ہائے، میں برباد ہو گیا۔ کتنی مشکل سے شکار ملا تھا، اُمید تھی کہ محنت وصول ہو جائے گی۔ مگر یہاں تو قصہ ہی دوسرا نکل آیا۔ ہائے میری قسمت۔“

”میں نے سوداگر سے کہا کہ آپ غم نہ کریں میں آپ کو اس سے زیادہ ہیرے دے دوں گا جتنے آپ کو گوشت کے اُس لوتھڑے سے ملتے۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا دامن کھولا اور سارے ہیرے اُسے دے دیے۔

میرا گھانا پورا ہو گیا اور میں پھر دولت مند بن گیا۔
یہ کہہ کر سندباد نے ایک لمبی سی سانس لی اور پھر
بولا "اچھا بھئی، اب رات زیادہ ہو گئی ہے۔ تم گھر
جاؤ۔ کل شام کو میں اپنے تیسرے سفر کا حال سناؤں گا۔"

سمندر کا بھتہ

شام کا وقت تھا۔ سندباد اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا
کہ اُس کے دوست آ پہنچے۔ سندباد انہیں کمرے میں
لے گیا اور جب سب آرام سے بیٹھ گئے تو اُس
نے اپنی داستان شروع کی۔ کہنے لگا:
"دوستو، جب میں خالی بیٹھ بیٹھ تنگ آ گیا تو سوچا،
ایک مرتبہ پھر سمندر کا سفر کرنا چاہیے۔ اب کے میں
نے ایک جہاز ہی خرید لیا اور جیسے کپڑے، تندرست اور
ہوشیار ملازم رکھے۔ پھر اُن میں سے ایک عقل مند
اور جہاں دیدہ ملازم کو جہاز کا کپتان بنا دیا۔"

”میں نے کئی اور سوداگروں کو بھی اپنے ساتھ چلنے اور دوسرے ملکوں میں اپنا مال بیچنے پر تیار کر لیا۔ جب سب تیار ہو گئے تو ہم بصرے سے روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک ملاح کا نام قبولی تھا۔ اُسے بہت سے قصے یاد تھے۔ اس کی باتیں سُن کر مجھے خیال آیا کہ وہ جھوٹا ہے۔ بعض قصے ایسے سُناتا کہ سب حیران رہ جاتے۔

”دو مہینے کے بعد ہم نے ایک ایسا جزیرہ دیکھا جہاں آدمی تو آدمی، پرندہ تک نہ تھا۔ ہاں پھلوں کے درخت بہت تھے۔ ہم یہاں رُکے تو ہمیں ایک بڑا سا سفید گنبد دکھائی دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی ”اڑن پہاڑی“ کا انڈا ہے۔

”میں ڈر کے مارے جہاز سے نہیں اُترا۔ مگر دوسرے مسافر اور ملاح سیر کرنے چلے گئے۔ ان کے ساتھ قبولی بھی تھا۔ ان لوگوں نے انڈے پر پتھر مارنے شروع کر دیے۔ انڈا ٹوٹ گیا۔ اس کے اندر درخت کے برابر ایک بچہ تھا۔ وہ لوگ بھاگ کر جہاز پر آ گئے اور

مجھے بتایا۔ میرا رنگ زرد پڑ گیا — میں نے کہا ”اُسے بے وقوف، یہ کیا مُصِیبت مول لی تم نے؟ وہ تو اڑن پہاڑی کا انڈا تھا۔ اب شام قریب ہے۔ اس بچے کے ماں باپ آتے ہوں گے۔ اگر اُن کو معلوم ہو گیا کہ تم نے ان کے انڈے کو توڑا ہے تو تمھاری خیر نہیں۔“

”قبولی بڑا شیخی خورا تھا۔ بولا ”یا امیر، واللہ پروا نہ کیجیے۔ ہمارے پاس تلواہیں اور بھالے ہیں۔ ان پرندوں کے ٹکڑے کر دیں گے اور بھُون بھُون کر کھائیں گے۔ سمندری پرندوں کا گوشت بڑا مزے دار ہوتا ہے۔ میں اُسے بہت سے پرندے بھُون کر کھا چکا ہوں۔“

”اتنے میں آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ اڑن پہاڑی ہمارے سروں پر تھی۔ نھوڑی دیر میں دوسری بھی دُور سے آتی نظر آئی۔ میں نے چیخ چیخ کر سب مسافروں کو جہاز پر بلایا اور جہاز روانہ کیا۔ کپتان نے حکم دیا کہ جتنا تیز جہاز چلایا جائے، چلاؤ۔ مگر نھوڑی ہی دیر میں وہ اڑن پہاڑی ہمارے اوپر پہنچ گئی۔ بالکل

ایسے لٹک رہے تھے جیسے کسی پھپھر میں مکڑی کا جالا۔
پھر دوستو، اُس اڈن پہاڑی نے وہ بھاری پتھر ہمارے
اوپر گرا دیا۔

”اُف، بڑے غضب کا دھماکا ہوا۔ اس کے بعد مجھے یاد
نہیں کیا ہوا، کیا نہیں ہوا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔
جب ہوش آیا تو میں ایک جہاز کے تختے پر پڑا تھا معلوم
ہوا کہ جہاز غرق ہو گیا ہے اور سارے ملاح اور مسافر بھی
ڈوب گئے ہیں۔ اب میں تھا اور ہزاروں میل لمبا سمندر۔
”ساری رات میں تختے پر پڑا اللہ اللہ کرتا رہا۔ لہریں
تختے کو نہ جانے کدھر لے جا رہی تھیں۔

”صبح ہوئی، سورج نے سر اٹھایا، تاروں نے ڈوبی کھائی۔
دور خشکی دکھائی دی۔ میں تختے کو اُسی طرف تیراتا لے چلا۔
تھک کر پُور ہو گیا تھا مگر خدا نے مجھے میری محنت
کا انعام دیا۔ کنارے پر بہت سے درخت تھے اور
درختوں میں پھل لٹک رہے تھے۔ پھل کھائے تو جان
میں جان آئی۔ اب میں نے یہاں کی سیر شروع کی۔ میں
یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں انسان بھی ہیں یا نہیں۔

سروں پر تھی۔ اس کے پنجے میں ایک بہت بڑا پتھر
تھا۔ اس پتھر کو اُس نے جہاز
کے اوپر تاک کر چھوڑ دیا۔

پکتان نے اپنی
اُستادی دکھائی

اور جہاز
کو گھا دیا۔

اس سے

یہ ہوا کہ وہ چٹان جیسا پتھر جہاز کے بیچوں بیچ تو نہیں
گر سکا، ہاں پچھلے حصے پر گرا اور وہ حصہ ٹوٹ کر
سمندر میں جا پڑا۔

”سارا جہاز ہل گیا، چکر کھانے لگا۔ وہ اڈن پہاڑی اپنا
کام کر کے اوپر اُٹھ گئی۔ اس کے بعد دوسری آئی۔ وہ
بھی پنجے میں ایک بہت بڑا پتھر لے کر آئی تھی۔ پکتان
نے بیخ کن کر کہا ”تیر مارو۔ سارے ملاح آ جائیں۔ تیر مارو۔“
”سب ملاح اپنے تیر کمان لے کر آ گئے اور اُنھوں
نے تیر مارے۔ مگر وہ تیر اڈن پہاڑی کے پروں میں



کام کرے گا۔ میں نے اُسے گردن پر بٹھا لیا اور ندی کے پار لے آیا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جتنا ہلکا معلوم ہوتا تھا، اتنا ہلکا نہیں ہے۔ اُس میں تو منوں بوجھ تھا۔ ندی کے پار جا کر میں جھکا۔ اسے نیچے اُتارتا چلا۔ مگر دوستو، وہ بوڑھا نہیں اُترا۔ اُس نے اپنی ٹانگیں میری گردن میں پھنسا دیں۔ لگا گردن دبائے۔ میں نے بہت کہا کہ بابا اُتر جا، میری گردن چھوڑ دے مگر وہ نہ مانا۔

”اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کے پاؤں آدمیوں کے سے نہیں ہیں۔ گھوڑے گدھے جیسے ہیں۔ یہ دیکھ کر میرا جی گھبرایا۔ نہ معلوم یہ کون ہے؟ جن ہے، بھوت



ہے، کیا بلا ہے؟ میں نے زور لگا کر اُسے گرانے چاہا۔

سارا دن گھومتا پھرا۔ کوئی انسان نظر نہ آیا۔ رات کو ایک درخت کے نیچے گھاس کے بستر پر لیٹ گیا۔ صبح ہوئی تو پھر آگے بڑھا۔ کافی دُور جا کر ایک ندی ملی۔ اس کا پانی دودھ کی طرح سفید تھا اور ویسا ہی میٹھا۔ ”ندی کے اُس پار ایک گھونسلہ نظر آیا۔ تعجب ہوا۔ زمین پر کون بے وقوف پرندہ گھونسلہ بنا گیا؟ اودہ ہو۔ گھونسلہ نہیں وہ تو ایک بوڑھا آدمی تھا۔ مگر اس کا قد نیچے کے برابر تھا۔ اس کے قد سے بڑی اس کی ڈاڑھی تھی۔ اس ڈاڑھی نے اسے ڈھانک رکھا تھا۔

”اس بونے سے بوڑھے نے مجھے دیکھا تو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اپنے پاس بلایا۔ ندی میں پانی کم تھا۔ میں اُس طرف جا پہنچا اور بوڑھے کو سلام کیا۔ خیریت پوچھی مگر وہ میری بات نہ سمجھا۔ بس اشارے کرنے لگا۔

”اصل میں وہ میری بولی نہیں جانتا تھا۔ خیر، اس کے اشاروں سے میں سمجھا کہ وہ کہتا ہے، مجھے اُٹھا کر لے چلو۔ مجھے اُس پر رحم آیا۔ سوچا، کم زوروں کی مدد کرنا ثواب کا کام ہے۔ میں اس کا کام کروں گا تو خدا میرا

اور ٹھٹک کدو بھی۔ میں نے ایک ٹھٹک کدو اٹھایا۔ اُسے اندر سے صاف کیا۔ وہ پیالہ سا بن گیا۔ سوچا، چلو، پانی پینے کی تو آسانی ہوئی۔ دوسرے دن انگور کی بیل کا باغ بلا۔ موٹے موٹے انگور لگے ہوئے تھے۔ بوڑھا، میری گردن پر بیٹھا، انگور توڑ کر کھاتا رہا۔ مجھے بھی خدا نے ایک ترکیب سبھائی۔ میں نے انگور توڑ کر ان کا رس کدو میں بھرا۔ پھر یہ کدو دھوپ میں رکھ دیا۔ ”وہاں سے یہ بوڑھا مجھے آگے لے گیا۔ کئی دن بعد میں پھر اسی طرف آیا جہاں کدو میں انگور کا رس چھوڑ گیا تھا۔ یہ رس دھوپ میں پڑے پڑے زہر بن گیا تھا۔ میں نے کدو اٹھا کر جھوٹ موٹ منہ سے لگایا اور پھر مست ہو کر خوب ناچا کودا۔ بوڑھا سمجھا، یہ بہت مزے دار چیز ہے۔ اشارہ کر کے کدو مجھ سے لیا اور غٹ غٹ سارا رس پی گیا۔ پیئے ہی جھومنے لگا۔ اتنا جھوما کہ اس کی ٹانگیں پلنے لگیں اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

”میں اُسے ایسی جگہ لایا جہاں پتھر پڑے تھے۔ میں

مگر وہ کیا کرتا۔ اُس نے اپنی ٹانگوں سے میرا گلا دبا لیا۔ ”اب اُس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا کہ ادھر چل۔ مجھے چلنا پڑا۔ وہ میری گردن پر بیٹھے بیٹھے دختوں کے پھل توڑتا رہا، کھاتا رہا۔ جب میں اس کے اشارے پر نہ چلتا تو وہ اپنی ٹانگوں سے میری گردن دباتا یا میرے سر پر تھپڑ مارتا۔

”آخر ایک جگہ میں تھک کر گر پڑا مگر وہ پھر بھی میری گردن پر سوار رہا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُس کو کندھوں سے اتار پھینکوں۔ مگر اُس نے میری گردن اپنی ٹانگوں سے ایسی پکڑ رکھی تھی کہ وہ بالکل ٹس سے ٹس نہ ہوا۔ اب شام ہو گئی تھی۔ میں زمین پر لیٹ گیا۔ اُس بوڑھے نے میری گردن پھر بھی نہ چھوڑی۔ دوسرا دن ہوا تو پھر وہی حال۔ اس کے بعد تیسرا دن ہوا اور پھر چوتھا دن۔ مجال ہے کہ بوڑھا ایک پل کو بھی میری گردن سے اُترا ہو۔

”کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ اب میں ایسی جگہ پہنچا، جہاں کدو کا کھیت تھا۔ اس کھیت میں تازہ کدو بھی تھے

کپڑے پھٹ گئے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ سارا مال تو جہاز کے ساتھ ڈوب گیا۔ پھر یہ جہاز، جس پر اب سوار ہوں، بغداد نہیں جا رہا۔ کپتان مجھے کسی ان جان بندرگاہ پر اتار دے گا۔ وہاں کیا کروں گا؟ مگر پھر دل کو تسلی دیتا کہ خدا میری مدد کرے گا۔

"کچھ دن بعد جہاز ایک بندرگاہ پر پہنچا۔ کپتان نے مجھے یہاں اتار دیا۔ میں اس اجنبی شہر میں اکیلا رہ گیا۔ نہ کھانے کو جیب میں پیسا، نہ رہنے کو گھر، نہ کوئی دوست، عزیز۔ دوسرے دن مجھے ایک بھلا آدمی ملا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا، ہاتھ ملایا۔ اس آدمی نے پوچھا، آپ کو کوئی کام آتا ہے؟ میں نے کہا صاحب، سوداگری کرتا ہوں۔ نہ مجھے لکڑی کا کام آئے، نہ لوہے کا۔ حیران ہوں کہ کس طرح اس شہر میں گزارہ کروں گا اور کس طرح بغداد تک جا سکوں گا۔

"وہ بھلا آدمی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اندر سے کپڑے کا ایک تھیلہ لایا، مجھے دیا اور کہا: "اے بھائی، سمندر

نے زور لگا کر بوڑھے کو پتھروں پر پٹک دیا اور پھر وہاں سے ایسا بھاگا کہ دود تک بھاگتا ہی چلا گیا۔ "اب میں بھاگم بھاگ ساحل پر آیا، اس اُمید میں کہ کوئی جہاز دکھائی دے تو اس سُنسان جزیرے سے نکلوں۔ کئی دن تک یونہی گھومتا پھرا۔ بھوک لگتی تو پھل کھا لیتا، زیند آتی تو سو جاتا۔ آخر خدا نے میری سُن لی۔ ایک جہاز آتا دکھائی دیا۔ میں نے اشاروں سے اُسے اپنی طرف بلایا۔ جہاز والوں نے مجھے دیکھ کر بادبان اُتارے اور جہاز کا رُخ ساحل کی طرف کیا۔ "جہاز ساحل پر پہنچا تو ہر شخص نے مجھے دیکھ کر تعجب کیا۔ پوچھا، میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میں نے اُنھیں اپنی مصیبت کا قصہ سُنایا۔ کپتان کو مجھ پر ترس آ گیا۔ بغیر کرایہ لیے مجھے جہاز پر بٹھایا۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ سمندر کا بھٹنا تھا۔ خدا نے تم پر رحم کیا۔ ورنہ ساری عمر وہ تم پر سوار رہتا۔ "میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ ملاح مجھے روٹی کھلاتے تھے۔ کپڑے بھی اُنھوں نے ہی دیے۔ میرے

سے کنکر نکال نکال کر بندروں کے مارنے شروع کیے۔ اس پر بندروں نے ناریل توڑ کر بواب میں مارے۔ یہ لڑائی خاصی مزے دار تھی۔ زمین سے کنکر پتھر مارے جا رہے تھے اور درختوں سے ناریل اور چھالیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ لوگ چھالیاں اور ناریل اٹھا اٹھا کر تھیلوں میں ڈال لیتے تھے۔

"اب میں سمجھا کہ یہ تو فائدے کا کام ہے۔ چھالیوں کے ایک درخت کے نیچے میں بھی چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر بندروں نے دانت دکھائے اور خوں خاں کی۔ میں نے پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکے۔ بندروں نے چھالیاں توڑ توڑ کر میرا نشانہ بنایا۔ جب بہت سی چھالیاں جمع ہو گئیں تو میں نے تھیلے میں ڈال لیں۔ اس کے بعد سب واپس شہر آ گئے۔

"میں سیدھا اپنے مہربان دوست کے گھر پہنچا۔ سارا قصہ بیان کیا، اس کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے اچھا کام بتایا۔ اُس بھلے آدمی نے مجھے اپنے گھر کے باہر ایک کوٹھڑی دکھائی اور کہا "اس میں روز کی کمائی جمع کرتے رہو۔ سب یہ کوٹھڑی بھر جائے تو جہاز میں بیٹھ کر بغداد چلے جانا"

"دوسرے دن میں پھر تھیلے میں کنکر پتھر بھر کر جنگل میں پہنچا

کے کنارے جا۔ وہاں باریک باریک کنکریاں ہوں گی۔ اُن کو چُن کر اس تھیلے میں بھر لے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے اور کنکریاں جمع کریں گے۔ پھر وہ جنگل کی طرف جائیں گے۔ تو بھی ان کے پیچھے ہو لینا۔ جو کچھ وہ کریں تو بھی کرنا۔

"دوسرے دن میں سمندر کے کنارے گیا اور تھیلے میں کنکریاں جمع کرنے لگا۔ اتنے میں اور بھی کئی آدمی آ گئے۔ ان کے پاس بھی تھیلے تھے۔ جب ان کے تھیلے کنکریوں سے بھر گئے تو وہ جنگل کی طرف چلے۔ اس جنگل میں ناریل اور چھالیوں کے درخت تھے۔ ناریل اور چھالیوں کے درخت بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ان پر انسان کا چڑھنا مشکل ہے۔ ان کے تنوں پر کانٹے اور کیلیں سی لگی ہوتی ہیں کہ آدمی چڑھے تو ہاتھ، پاؤں زخمی ہو جائیں۔ ہاں، بندر ان پر خوب مزے میں چڑھتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بے شمار بندر ان درختوں پر اُچھل کود رہے ہیں۔

"شہر سے جو لوگ آئے تھے، وہ ادھر ادھر پھیل گئے۔ میں بندروں کے کھیل تماشے دیکھتا رہا۔ لوگوں نے تھیلوں

آج میں نے ناریل کے درخت پر بیٹھے ہوئے بندروں کو نشانہ بنایا۔
درخت سے دھڑا دھڑا ناریل گرنے لگے۔ بس دوپٹو، کسی دن میں
چھالیاں بھر کر لاتا اور کسی دن ناریل۔ دو بیٹے کے بعد کوٹھڑی
بھر گئی۔ کچھ مال میں نے اسی شہر میں بیچا اور بغداد کا کرایہ اکٹھا کر
لیا۔ چند دن بعد ایک جہاز بصرے کی طرف جا رہا تھا، میں نے کرایہ
وغیرہ ملے کر کے چھالیاں اور ناریل کی بوریاں جہاز میں لادیں۔ اپنے
مہربان بھلے آدمی کا شکریہ ادا کیا اور بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔
”اس جہاز پر اور بھی کئی سوداگر سوار تھے مگر چھالیاں اور ناریل
کسی کے پاس نہیں تھے۔ اس بات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جب
ہمارا جہاز کسی جزیرے پر رکتا تو مجھے چھالیاں اور ناریل کی کافی
قیمت مل جاتی۔ میں اس کے بدلے گرم مسالا خرید لیتا۔
”جب میں بصرے کی بندرگاہ پر اُترا تو میرا مال ہاتھوں ہاتھ بک
گیا اور میں پھر مال دار آدمی بن گیا۔ میں نے ایک بوری اشرفیوں
سے بھری، دو بوریوں میں چاندی کے سکتے بھرے اور بغداد پہنچا۔
بیدھا مسجد میں گیا، نماز پڑھی اور خدا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا جس
نے فقیر سے مجھے پھر مال دار آدمی بنا دیا تھا“